سالنامہ ۱۹۶۵ء

المنار

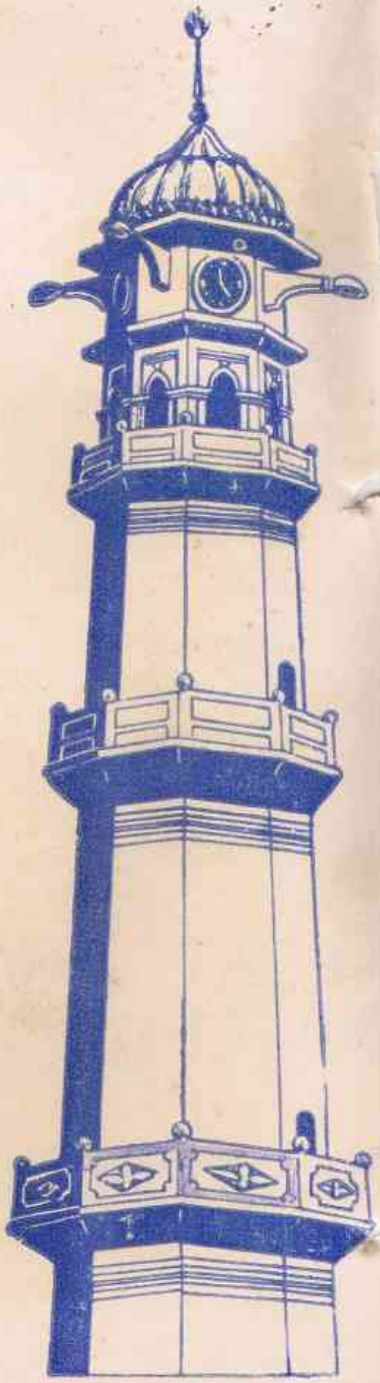

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

سالنامہ ۱۹۶۵ء

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

نگران :- شیخ محبوب عالم خالد ایم۔ اے

مدیر اعلیٰ :- عطاء المجیب راشد

مدیران :- سید شمشاد علی

مبارک احمد عابد ربانی

جلد ۱۴ —— جنوری تا جون ۱۹۶۵ء —— شمارہ ۲،۳

(جنید ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا)

عکس

- تبرکات :-

یقین اور توکل

حقیقی ایمان کا عملی اظہار

کلام الامام - امام الکلام

- آغاز کار :-

اداریہ و گذارشات	ادارہ تحریر
اجازتِ رخصت	عطاء المجیب راشد (مدیر اعلیٰ)

- مقالات و مضامین :-

قصیدہ نگاری پر ایک نظر	جنید ہاشمی
تدوین حدیث	عطاء المجیب راشد
روشنی اور رفعت کا نشان (المنار کی تاریخ)	داؤد طاہر
اُردو شاعری کا زریں دور (قسط ثانی)	لطف الرحمٰن محمود
مشاہیر سائنس	مرزا محمد لقمان احمد
اُردو بحیثیت قومی زبان	ہدایت اللہ ہادی
مخدوم بننے کا راز	محمد منظور صادق

- گلہائے رنگا رنگ :-

زرد پتے - سرخ پھول	(افسانہ)	سعید انجم
غبار دیکھتے رہے	(افسانہ)	محمد یار
ایک محفل شعر و سخن		منیر الحق شاہد
افکار پریشاں		صابر ذکی
ایک خط - جو خط کم ہے کسی مجذوب کی بڑ زیادہ (طنز و مزاح)		محمد انور قریشی
ضمیر کی آواز	(افسانہ)	صفدر علی
پہلی کوشش		نسیم احمد اقبال، خلیل احمد طاہر، انیس احمد جاوید
بلندیاں	(مستقل کالم)	عطاء الکریم شاہد، برکات احمد خالد، منور احمد، سید نعیم حیدر۔

- رنگ تغزل :-

شریک محفل	ثاقب زیروی، کلیم عثمانی، گلزار ہاشمی، نظر امروہی، مبارک عابد اور دوسرے۔

قال اللہ تعالیٰ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

یقین اور توکّل

یقین و توکّل کے بارہ میں ارشادِ باریتعالیٰ ہے :-

• " وتوكل على الحيّ الذي لا يموت "

کہ تو اپنے اس زندہ خدا پر توکّل کر جس پر کبھی موت نہیں آتی۔

• " فإذا عزمت فتوكّل على الله "

کہ جب تو پختہ عزم کرلے تو پھر خداتعالیٰ پر توکّل کر۔

جو شخص خداتعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے خداتعالیٰ اسکی مدد نصرت کا خود ذمہ لیتا ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا ہے :-

• " ومن يتوكّل على الله فهو حسبه "

کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکّل کرے گا۔ تو خدا خود اُس کے لئے کافی ہو جائے گا۔

حضرت عمرؓ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان فرماتے ہیں کہ :-

لو انكم تتوكّلون على الله حقّ توكّله لرزقكم كما يرزق الطير، تغدو خماصًا وتروح بطانًا۔

کہ اگر تم خداتعالیٰ پر اتنا توکّل کرو جس قدر اس کا واجبی حق ہے تو وہ تم کو پرندوں کی مانند رزق عطا کرے گا۔ یہ پرندے صبح کو خالی پیٹ گھروں سے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اور روایت بیان کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا :-

يدخل الجنّة اقوام افئدتهم مثل افئدة الطير۔

کہ جنّت میں ایسے لوگ داخل ہوں گے جن کے دل پرندوں جیسے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ توکّل کرنے والے ہوتے ہیں اور خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔

انسان کا فرض ہے کہ رحمت خداوندی سے کبھی مایوس نہ ہو۔ اپنی طرف سے محنت اور کوشش کا پورا حق ادا کرے اور پھر خدا پر کامل بھروسہ کرے اور اس کی مدد و نصرت پر یقین واثق رکھے۔ کیونکہ

إنّ الله لا يضيع أجر المحسنين۔

(ع - م - س)

تبرکات

محبّتِ الٰہی کا عملی اظہار

(کلمات طیّبات سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السّلام)

"اصل توحید کو قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت سے پُورا حصّہ لو۔ اور یہ محبت ثابت نہیں ہو سکتی جبتک عملی حصّہ میں کامل نہ ہو۔ نری زبان سے ثابت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی مصری کا نام لیتا رہے تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ شیریں کام ہو جائے۔ یا اگر زبان سے کسی کی دوستی کا اعتراف اور اقرار کرے مگر مصیبت اور وقت پڑنے پر اسکی امداد اور دستگیری سے پہلو تہی کرے تو وُہ دوست صادق نہیں ٹھہر سکتا۔ اسی طرح پر اگر خدا تعالیٰ کی توحید کا نرا زبانی ہی اقرار ہو اور اسکے ساتھ محبت کا بھی زبانی ہی اقرار موجود ہو تو کچھ فائدہ نہیں بلکہ یہ حصّہ زبانی اقرار کی بجائے عملی حصّہ کو زیادہ چاہتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ زبانی اقرار کوئی چیز نہیں ہے۔ نہیں میری غرض یہ ہے کہ زبانی اقرار کے ساتھ عملی تصدیق لازمی ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ خدا کی راہ میں اپنی زندگی وقف کرو۔ اور یہی اسلام ہے۔ یہی وُہ غرض ہے جس کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔ پس جو اسوقت اس چشمہ کے نزدیک نہیں آتا جو خدا تعالیٰ نے اس غرض کیلئے جاری کیا ہے وُہ یقیناً بے نصیب رہتا ہے۔ اگر کچھ لینا ہے اور مقصد کو حاصل کرنا ہے تو طالبِ صادق کو چاہیئے کہ وُہ چشمہ کیطرف بڑھے اور آگے قدم رکھے اور اس چشمۂ جاری کے کنارے اپنا مُنہ رکھدے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا جبتک خدا تعالیٰ کے سامنے غیریت کا چولہ اُتار کر آستانۂ ربوبیت پر نہ گر جاوے اور یہ عہد نہ کرلے کہ خواہ دُنیا کی وجاہت جاتی رہے اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں تو بھی خدا کو نہیں چھوڑے گا۔ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں ہر قسم کی قربانی کیلئے تیار رہیگا۔ ابراہیم علیہ السلام کا یہی عظیم الشان اخلاص تھا کہ بیٹے کی قُربانی کیلئے تیار ہو گئے۔ اسلام کا منشاء یہ ہے کہ بہت سے ابراہیم بنائے۔ پس تم میں سے ہر ایک کو کوشش کرنی چاہیئے کہ ابراہیم بنے۔"

(ملفوظات جلد سوم صفحہ ۱۸۸ و ۱۸۹)

اِدَارِیّہ

کامیاب زندگی کا حصول ہر انسان کا منتہائے مقصود ہے۔ کامیاب زندگی کے معیار میں اور اس کی دیگر جزئیات میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن ہر شخص کے ذہن میں کامیاب زندگی کا ایک خاص تصور ہوتا ہے اور اس تصوّر کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے وہ اپنی سی کوشش کرتا چلا جاتا ہے۔

زندگی میں کامیابی کے حصول کا جذبہ خود خالقِ فطرت نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے اور اسلام جو دینِ فطرت ہے اس جذبہ کی تسکین کے پورے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ اسلام نہ صرف اس جذبہ کو تسلیم کرتا ہے بلکہ خود اسکی وضاحت کرکے اس بات کی ترغیب دلاتا ہے کہ مومن ان بلند مراتب کو حاصل کرتے چلے جائیں۔ اسلام نے کامیاب زندگی کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ بندے کا اپنے خالقِ حقیقی سے عبودیت کا ایسا گہرا اور لازوال تعلق قائم ہوجائے کہ اس کے تمام افعال، اقوال، احساسات اور جذبات پر خدائی رنگ غالب آجائے اور کسی حالت میں بھی خدائی احکام سے سرمو انحراف کی جرأت نہ ہو۔ یہ وہ بلند مقام ہے جہاں قلب انسانی پر ایسی سکینت اور اطمینان کی کیفیت کا نزول ہوتا ہے جو انسان کو دنیاوی غموم و ہموم سے بے نیاز کرکے خدائے واحد و یگانہ کے آستانہ پر جھکائے رکھتی ہے۔

کامیاب زندگی وہی کہلا سکتی ہے جو اوّل تا آخر کامیاب ہو۔ کسی عارضی کامیابی کو اس وقت تک کامیاب زندگی پر محمول نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کامیابی کو دوام حاصل نہ ہو۔ اس لئے حقیقی کامیاب زندگی وہی ہوسکتی ہے جو دنیا و آخرت میں کامیاب ہو۔ دُنیا میں اپنے مقاصد کو حاصل کرلینا بڑی کامیابی ہے لیکن اصل سُرخروئی کا باعث یہ امر ہے کہ یہ کامیابی ایسی پائیدار ہو کہ اس زندگی کے ختم ہوجانے کے بعد بھی اسکے نیک اثرات کے نتیجہ میں یہ سلسلہ اخروی زندگی میں بھی جاری و ساری رہے۔ دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا جاتا ہے۔ گویا انسان جو اعمال اس دنیا میں کرتا ہے انہی کی جزا آخرت میں حاصل کرے گا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آخرت کی کامیاب زندگی کا آغاز دنیا کی زندگی سے ہی ہوجاتا ہے۔

لوگ دنیا میں اپنے مقاصد کی تکمیل کی خاطر اور زندگی کو کامیاب و کامران بنانے کیلئے ہر ممکن وسیلہ

بروئے کار لاتے ہیں لیکن اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ من کان فی ھذہٖ اعمٰی فھو فی الآخرۃ اعمٰی و اضل سبیلاً ۔ کہ جس شخص کی چشم بصیرت اس دنیا میں نور ہدایت سے محروم ہوگی وہ آخرت میں بھی تہی دامن ہوگا بلکہ اپنی بداعمالیوں کے سبب ضلالت و گمراہی کے راستہ پر قدم مارنے والا ہوگا۔ بڑا ہی خوش قسمت ہے وہ انسان جو اس حقیقت کو پالے اور ہر دم اس کوشش میں لگا رہے کہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے الٰہی کے مطابق خرچ ہو۔ تا وہ اس دُنیا میں بھی اپنے مقاصد کو حاصل کرے اور آخرت میں بھی رضوان خداوندی کی نعمت لازوال سے حصہ پانے والوں میں شامل ہو۔

(عطاء المجیب راشد)

ساتھیو! ۲۳ر مارچ کا دن پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم ترین دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب لاہور میں آج سے ٹھیک ۲۵ برس پہلے حضرت قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں 'قرار داد پاکستان' منظور کی گئی تھی۔ یہی وہ روز ہے جس روز قائداعظمؒ کا 'پاکستان' مسلمانوں کا پاکستان' بنانے کا عزم کیا گیا تھا۔ اس روز عہد کیا گیا کہ 'پاکستان' کو مسلمانوں کے دلوں کی واحد دھڑکن بنایا جائے گا۔ اور اس عزم کو عزم بالجزم بنایا گیا۔ ۲۳ر مارچ کا دن ہمیں اس عزم صمیم کی یاد دلاتا ہے جس کی بدولت ہم آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں ـــــ آج کا روز ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ اگر ارادہ بلند اور جان پُرسوز ہو تو ناممکن امور ممکن بلکہ سہل ترین امور میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ پرِ کاہ کی طرح اُڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دُھن، ایک لگن انسان میں برقی توانائی ہی نہیں جوہری توانائی بھی بھر دیتی ہے۔

دوستو! اس پاکستان کے لئے ہمارے آباء و اجداد نے ہر ممکن قربانی دی ہے۔ اپنی کئی آشاؤں اور تمناؤں کو بھینٹ چڑھا کر اسے حاصل کیا ہے۔ انہوں نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ صرف اس لئے کہ وہ آزادی جیسا بیش قیمت تحفہ اپنی آئندہ نسلوں کو عنایت کرتے جائیں۔ ان کی قربانیاں ہم سے اس بات کی متقاضی ہیں کہ ہم اپنے فرائض کو پہچانیں اور ان کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کریں۔

بھائیو! ہم طالب علم ہیں۔ ہمارا مقصد تعلیم حاصل کرنا ہے۔ اور پھر اس تعلیم کی شمع سے شمعیں جلاتے چلے جانا ہے۔ اسی عمل میں پاکستان کی خوشحالی و بقا کا راز مضمر ہے۔ ہم پاکستان کی عمارت کی بنیادی اینٹیں ہیں۔ اگر ہم میں کجی ہوگی تو عمارت کیونکر پختہ بن سکے گی؟ ۔ اپنی قدر پہچانو ـــــ کہ اقدار بدلتی رہتی ہیں ـــــ اپنی ذات، اپنے ذہن و قلب کو اُجلا بناؤ ـــــ پاکستان کی خوشحالی اور بقا و سلامتی کے لئے تگ و دو میں

باقاعدہ حصّہ لو۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤ۔ اور یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے جب تم اپنی پڑھائی سے غفلت نہ اختیار کرو۔

امتحانات سر پہ ہیں۔ ابھی پانی سر سے نہیں گذرا۔ اَب بھی وقت ہے کہ سنبھل جاؤ۔ تمام کرم فرماؤں سے علیحدگی اختیار کرو۔ امداد باہمی کے اصول کو اپناؤ۔ لیکن امتحان گاہ میں 'اپنی مدد آپ' کا اصول بہترین اصول ہے۔ اسے ہی اپنا وطیرہ بناؤ۔

اپنے خدا کو نہ بھولو۔ وہ صرف شکر گذاروں کو پسند فرماتا ہے۔ اور نہ صرف پسند فرماتا ہے بلکہ اپنی طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا بھی ہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراہیم آیت ۸)

"اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرو گے تو وہ تمہیں پہلے سے بھی بڑھکر نوازے گا۔"

پس کتنا آسان ہے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ۔ اور کس قدر سہل ہے قوم و ملک کی خوشحالی اور ترقّی میں فعّال حصّہ لینا۔ ساتھیو! آؤ آگے بڑھو۔ خدائے عزّوجل تمہیں اپنے مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

(شمشاد علی سیّد)

کالج کے طلباء کے دلوں میں اپنے مستقبل کے بارے میں عجیب و غریب قسم کے تصوّرات گھر کئے رہتے ہیں۔ سکول کی نسبت یہ احساسات کالج میں قوی اور پختہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سے عام تعلیم کی منزل ذرا قریب ہی نظر آتی ہے۔ طلبہ کے سُپنوں کے تانے بانے عموماً اس نقطۂ نظر کے اردگرد بُنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ہم خود کو ایک عظیم شخصیّت بنائیں گے۔ مگر اکثر احباب کا یہ شخصیّتی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کی خیالی گاڑی فقط تمنّاؤں اور خواہشوں کی پٹڑی پہ رینگتی رہتی ہے۔ یہ صاحبان صرف شیخ چلّی کی ڈگر پہ چلتے ہیں۔ ان کی جیون دیوی ہاتھ کی نسبت بات پر زیادہ اعتقاد رکھتی ہے۔ جس کے سبب سے ان کی شخصیّت بجائے اجاگر ہونے کے پہلے سے بھی مدھم ہو جاتی ہے۔ البتہ کچھ طلبہ اپنی شخصیّت کو جاذبیّت، متانت اور عظمت کا رنگ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ مستقبل میں اپنی شخصیّت کا وہ تاج محل تعمیر کر ہی لیتے ہیں۔ جس کے ابتدائی خاکے وہ کالج کے ایّام میں بناتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ چند باوقار شخصیّات کس طرح برتری حاصل کر لیتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عظیم شخصیّات صرف خیالی گھوڑے دوڑا کر یا خواہشوں کے اُڑن کھٹولے کے بل بوتے پر

منزلِ عظمت حاصل نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کے سامنے بچپن اور نوخیزی میں ہی اہم مقاصد اور ضروری ارادے ہوتے ہیں۔ جن کو پُورا کرنے کے لئے وہ ہمّت اور عمل سے کام لیکر دوسروں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ اہلِ ہمّت کے سامنے اہم مقاصد ہوتے ہیں اور عام آدمیوں کے سامنے خواہشیں۔

میرے دوستو! ہم بھی عظیم شخصیات بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتے ہیں۔ اگر ہم بھی اہلِ ہمّت کی طرح چند ٹھوس اور اہم مقاصد حاصل کرنے کے لئے صحیح جد و جہد کریں۔ اُٹھو دوستو! ہم عملی اقدام اُٹھائیں اور ایسے مضبوط ارادوں سے شاہراہِ ترقّی پر گامزن ہونے کا امتیاز حاصل کریں کہ حادثات و واقعات کے روڑے ہماری راہوں میں اٹکنے کے بجائے ہمارے قدم تیز تر کردیں۔ ہمارے دِلوں میں اگر مصمّم ارادے پیدا ہوجائیں۔ تو ہم سب کچھ کرسکتے ہیں۔ میرے دوستو! اگر ہم آج اپنے مقاصدِ جلیلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ تو کل ہم باوقار شخصیّات میں سے ہونگے۔

(مبارک احمد عابد)

مدیر اعلیٰ المنار

عطاءالمجیب راشد

ہمارے کالج کے ایک ہردل عزیز اور ہونہار طالب علم، ادیب اور مقرر۔ عطاءالمجیب راشد۔جو گذشتہ اڑھائی سال سے کالج میگزین المنار (حصہ اردو) کے مدیر اعلی کے طور پر ادارت کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ آپ سال گذشتہ (۶۴-۶۵) میں کالج یونین کے سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ اور مجلس ارشاد کے صدر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر آپ مختلف سالوں میں اٹھارہ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ آپ ایک کامیاب مقرر ہیں اور بیرونی کالجوں کے مباحثات سے متعدد انعامات حاصل کرچکے ہیں۔ اپنے کالج کے سالانہ مباحثات میں چار سال تک ایوان کی قیادت کی۔ آپ نے مسلسل چار سال تک کالج کے اردو زبان کے بہترین مقرر ہونے کا اعزاز حاصل کیا بی اے کے امتحان میں عربی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے دو طلائی تمغے بطور انعام حاصل کئے اور وظیفہ کے مستحق قرار دئے گئے۔

مدیر المنار

مبارک احمد عابد ربانی

ہمارے کالج کے جانے پہچانے مترنم شاعر اور ادیب۔ مبارک احمد عابد ربانی جو گذشتہ تین سال سے کالج میگزین المنار (حصہ اردو) کی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ آپ بزم اردو کے معتمد اور نائب صدر بھی رہے ہیں ۔ شاعری اور اردو ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں ۔ ایف اے کے امتحان میں آپ وظیفہ کے مستحق قرار دئے گئے ۔ اس وقت بی اے سال دوم میں تعلیم پا رہے ہیں ۔

گذارشات

● ایک لمبے انتظار کے بعد المنار کا ۱۹۶۵ء کا سالنامہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ ہم اس سالنامہ میں طلبائے کالج کی علمی و ادبی اور ذہنی استعدادیں بڑھانے کا زیادہ سے زیادہ مواد پیش کرسکیں۔ خدا کرے کہ ہم اس مقصد میں کامیاب رہے ہوں اور المنار اپنے حقیقی مقصد کو پورا کرے۔ آمین

● مضامین کے انتخاب کے سلسلہ میں یہ بات مدنظر رکھی گئی ہے کہ صرف ہلکے پھلکے اور طنز و مزاح سے پُر مضامین ہی المنار میں جگہ نہ پائیں بلکہ ٹھوس اور علمی مقالات بھی شامل ہوں تاکہ طلباء اور قارئین کرام کی علمی و ادبی تشنگی دُور کی جاسکے۔ اسی غرض سے متنوع نوعیت کے مقالات کو جگہ دی گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس انتخاب کو پسند فرمائیں گے۔

● ہمیں خوشی ہے اور ہم اس کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مرتبہ طلباء نے ہمارے ساتھ تعاون فرمایا اور بہت سے مضامین برائے اشاعت بھجوائے جن میں سے اکثر اس مرتبہ شامل کئے جارہے ہیں۔ ہم تمام مضمون نگار حضرات کے ممنون احسان ہیں۔

● گذشتہ سال ہم نے "اصلاح معاشرہ میں طالبعلم کا کردار" کے موضوع پر مضمون نویسی کے انعامی مقابلہ کا اعلان کیا تھا۔ اس مقابلہ کے لئے جتنے مضامین موصول ہوئے ان میں سے داؤد طاہر (بی اے سال دوم) کا مضمون ہماری رائے میں سب سے بہترین ہے۔ اعلان کے مطابق ان کو اوّل انعام دے دیا گیا ہے۔ ان کا مضمون آئندہ شمارہ میں شامل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ اعزاز ان کے لئے مبارک کرے۔ اس مقابلہ کیلئے دُوسرے طلباء کے جو مضامین ہمارے پاس آئے ہیں وہ بھی انشاء اللہ آئندہ شماروں میں شائع کئے جائیں گے۔

● المنار کا آئندہ شمارہ چھٹیوں کے بعد شائع ہوگا۔ اِس کے لئے اپنی نگارشات جلد از جلد اراکینِ ادارہ تک پہنچادیں۔

● ایک تعلیمی سال کا اختتام ہوا چاہتا ہے۔ ہم اس درسگاہ سے رخصت ہونے والے طلباء کو صمیم قلب سے الوداع کہتے ہیں اور دُعاگو ہیں کہ خدا ہر گام پر ان کا حافظ و ناصر ہو۔ اور ؎

سر پہ اللہ کا سایہ رہے ناکام نہ ہو

(ادارہ)

کلام الامام

(سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام)

اسلام سے نہ بھاگو راہِ ہدیٰ یہی ہے
اے سونے والو جاگو شمس الضحیٰ یہی ہے

مُجھ کو قسم خُدا کی جس نے ہمیں بنایا
اب آسماں کے نیچے دینِ خُدا یہی ہے

وُہ دِلستاں نہاں ہے کس رہ سے اُسکو دیکھیں
ان مشکلوں کا یارو مشکل کُشا یہی ہے

باطن سیہ ہیں جنکے اس دیں سے ہیں وُہ منکر
پر اے اندھیرے والو دِل کا دیا یہی ہے

سب خشک ہو گئے ہیں جتنے تھے باغ پہلے
ہر طرف مَیں نے دیکھا بُستاں ہرا یہی ہے

جب کھل گئی سچائی پھر اس کو مان لینا
نیکوں کی ہے یہ خصلت راہِ حیا یہی ہے

ملتی ہے بادشاہی اس دیں سے آسمانی
اے طالبانِ دولت ظلِّ ہما یہی ہے

سو سو نشاں دِکھا کر لاتا ہے وُہ بُلا کر
مُجھ کو جو اُس نے بھیجا بس مُدعا یہی ہے

(درثمین)

اِمَامُ الکلام

(سیّدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ)

بڑھتی رہے خدا کی محبّت خدا کرے
حاصل ہو تم کو دید کی لذّت خدا کرے

توحید کی ہو لب پہ شہادت خدا کرے
ایماں کی ہو دِل میں حلاوت خدا کرے

پڑھ جائے ایسی نیکی کی عادت خدا کرے
سرزد نہ ہو کوئی بھی شرارت خدا کرے

حاکم رہے دِلوں پہ شریعت خدا کرے
حاصل ہو مصطفٰے کی رفاقت خدا کرے

مِل جائیں تم کو زہد و امانت خدا کرے
مشہور رہو تمہاری شرافت خدا کرے

ہر گام پر فرشتوں کا لشکر ہو ساتھ ساتھ
ہر ملک میں تمہاری حفاظت خدا کرے

تم ہو خدا کے ساتھ، خدا ہو تمہارے ساتھ
ہوں تم سے ایسے وقت میں رخصت خدا کرے

اِک وقت آئے گا کہ کہیں گے تمام لوگ
مِلّت کے اس فدائی پہ رحمت خدا کرے

(کلامِ محمود)

الوداعیہ

اجازت رخصت

اب تو چلتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

المنار کا یہ شمارہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میرے عہد ادارت کا آخری شمارہ ہے۔ اس مناسبت سے میں ایک مختصر سا الوداعی نوٹ سپرد قلم کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

مجھے المنار میں قریباً اڑھائی سال تک کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ یوں تو جس دن میں کالج میں داخل ہوا تھا، اسی روز سے المنار سے وابستہ ہوں لیکن مارچ ۱۹۶۳ء میں میں رسالہ کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوا۔ اور نئے تعلیمی سال (ستمبر ۱۹۶۳ء) سے ادارت کی تمام تر ذمہ داری میرے سپرد کی گئی۔ اور آج المنار کو الوداع کہتے ہوئے میری جبین نیاز مندی بارگاہِ احدیت میں سجدۂ تشکر و امتنان پر انتہائی عاجزی و خاکساری کے ساتھ سجدہ ریز ہے۔ کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے خاکسار کو اس عظیم ذمہ داری سے اپنی پوری استعداد کے مطابق عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اللہ تبارک و تعالےٰ کا یہ بے انتہا کرم اور فضل ہے اور اس کے لئے میں جس قدر بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس عظیم ذمہ داری کو اٹھانے کا خیال نہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے آپ کو اس کا اہل تصور کرتا تھا۔ اس کے باوجود اگر اس عرصہ میں مجھے کوئی تعمیری کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ تو یہ خدا تعالےٰ کی خاص ذرّہ نوازی کا کرشمہ ہے مجھ ناتواں کو اس کام کی توفیق ملنا خدائے بزرگ و برتر کی نوازش کریمانہ ہے۔ وللہ الحمد فی الاولیٰ والاخرۃ۔

رسالہ خواہ کوئی ہو، اس کی ادارت کوئی آسان کام نہیں۔ المنار ہمارے کالج کا واحد ترجمان ہے۔ اس کی عظمت، سنجیدگی اور توقیر کو قائم رکھنا ایک اہم فریضہ ہے۔ میں یہ الفاظ لکھتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنے عہد ادارت میں المنار کو صحیح لائنوں پر چلانے اور اس کی مخصوص روایات سے ہم آہنگ رکھنے کی توفیق ملی۔ اسی مسلک کی وجہ سے المنار کو پاکستان کے تمام کالجوں کے مجلات میں ایک **امتیازی** اور **منفرد حیثیت** حاصل ہے۔

المنار کالج کے طلبہ کا رسالہ ہے اور میری کوشش رہی ہے کہ اس میں طلبہ کے خیالات کی ترجمانی ہو۔ اور ان کی ہی نگارشات اوّلیت کا درجہ پائیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر نشستِ اوّل اور پہلی کوشش کے عنوان سے نئے مضامین لکھنے والوں کے مضامین شائع کئے جاتے رہے۔ مختلف معاشرتی نقوش کو اجاگر کرنے کے لئے "پگڈنڈیاں" کے عنوان سے ایک مستقل کالم جاری کیا گیا ہے جو بڑی خوبی سے جاری ہے۔ مضامین کے انتخاب میں میری یہ کوشش رہی ہے کہ تنوع کو قائم رکھا جائے اور طلبہ کے ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ مفید مقالات اور ادبی نگارشات پیش کی جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے مضامین کا بھی سلسلہ جاری رہا ہے۔ الغرض میں نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ المنار کے معیار کو ہر لحاظ سے بلند تر کیا جائے۔ چنانچہ ہر شمارہ کی تدوین کے وقت اس مقصد کو مدّنظر رکھا۔ اور گذشتہ سال کے سالنامہ کو تو میں اپنے عہدِ ادارت کی یادگار کے طور پہ پیش کر سکتا ہوں۔

المنار حصّہ اردو کی ادارت کے ساتھ ساتھ مجھے کچھ عرصہ حصہ انگریزی کی ادارت کرنے کا بھی موقع ملا۔ نیز حصّۂ عربی کی ترتیب اور اشاعت کا کام بھی میرے ہی سپرد رہا۔

اللہ تعالےٰ کا بے حد شکر ہے کہ اس نے مجھے ہر سہ ذمہ واریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دی۔ المنار سے وابستگی کے دوران میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اور المنار کا یہ احسان ہے، جو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کالج کے اس ترجمان کو طلباء کی صحیح ترجمانی اور راہنمائی کرتے ہوئے ٹھوس خدمات بجالانے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین

المنار سے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ اب مجھے اس محبوب درسگاہ سے بھی الوداع ہونا ہے۔ کیونکہ خاکسار اس سال ایم اے عربی کے فائینل امتحان میں شریک ہو رہا ہے۔ کالج میں طالبعلمی کا یہ چھ سال کا عرصہ میری زندگی کا ایک خوشگوار زمانہ تھا۔ اور اس کی یاد میرے دل سے محو نہ ہوگی۔ خدا کرے کہ یہ درسگاہ ترقی کی راہ پہ گامزن رہے، اور عروج کی بلند ترین منازل سے ہمکنار ہو۔ مجھے اس مادرِ علمی سے وابستہ رہنے پہ ہمیشہ فخر رہیگا۔ اور خدا کرے کہ مجھے ایسے طور پہ خدمتِ دین بجا لانے کی توفیق ملے کہ میں اس درسگاہ کا نام روشن کرنے والوں میں سے ایک ہوں۔

عنقریب میرا امتحان شروع ہو رہا ہے۔ میں اپنے شفیق پرنسپل، محترم اساتذہ، ہم مکتب بھائیوں اور سب قارئین سے اعلیٰ اور نمایاں کامیابی کیلئے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ مجھے اپنی رضا کی راہوں پہ چلنے کی توفیق دے اور ایسے نیک اعمال بجالانے کی توفیق دے جو اسکے حضور مقبول ہوں اور دنیا و آخرت میں سُرخروئی کا موجب ہوں۔ آمین

درد بھرے دل کے ساتھ اور نیک تمناؤں کو اپنے سینے میں لیئے ہوئے میں اس مادرِ علمی سے، اسکے معزز اساتذہ سے اور اس سے فیض یاب ہونے والے ہم مکتب بھائیوں سے اجازتِ رخصت چاہتا ہوں۔ خدا تعالیٰ ہم سب کے ساتھ ہو۔ آمین

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
الوداع اہلِ چمن! ہم تو سفر کرتے ہیں

خاکسار عطاء المجیب راشد
مدیر اعلیٰ المنار
ایم اے عربی (فائینل) تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

مقالات و مضامین

- جنید ہاشمی
- عطاء المجیب راشد
- داؤد طاہر
- لطف الرحمٰن محمود
- مرزا محمد لقمان احمد
- ہدایت اللہ ہادی
- محمد منظور صادق

جنید ہاشمی

قصیدہ نگاری پر ایک نظر

اصنافِ سخن میں قصیدہ غالباً سب سے پُرانی صنف ہے جو عربی سے فارسی میں سے ہوتی ہوئی اُردو میں آئی ہے۔ پُرانے زمانہ میں علاوہ غزل کے قصیدہ نگاری کرنا ایک طرح کا امتحانِ شاعری تھا۔ اور اسے معیارِ کمال تصور کیا جاتا تھا۔ اسی لئے شائد فارسی میں بڑے بڑے باکمال قصیدہ نگار پیدا ہوئے ہیں۔

قصیدہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جو لکھنے والے نے "بالقصد" کہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ میں تصنع اور بناوٹ کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ لیکن دیگر اصنافِ سخن کی طرح اس کی بھی ایک ہیئت اور فارم (FORM) ہوتی ہے۔ اس کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے مقفّٰی ہوتے ہیں۔ لیکن بعد کے اشعار کی تعداد متعین نہیں کی جاسکتی اوسطاً پچیس اشعار ہونے چاہئیں اگرچہ ڈیڑھ سو سے لے کر تین سو اشعار پر مشتمل قصائد بھی موجود ہیں۔ امراؤ القیس کا مشہور عربی قصیدہ "لامیہ" کے تین صد اشعار ہیں۔ تاہم تکنیک کے لحاظ سے قصیدہ کو ہماری موجودہ اصنافِ سخن میں کسی ایک مخصوص صنف میں نہیں لایا جاسکتا۔ کیونکہ یہ ایک مرکب صنف ہے۔ اس میں وحدت نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس کے مختلف حصے باہم متجانس ہونے چاہئیں۔

عربی میں قصیدہ بیشتر قدرتی اور نیچرل مضامین پر مشتمل ہوتا تھا خصوصاً تشبیب میں شاعر اپنے صحیح جذبات کا اظہار کرتا تھا۔ اسی طرح قصیدے کے دیگر اجزاء میں مخلصانہ اور راستبازانہ شاعری کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب عربوں کی بدویت کسی حد تک مدنیت میں بدل گئی۔ تو اس میں تخیلیت پیدا ہوگئی۔ خصوصاً بنو عباس کے دورِ حکومت میں تخئیل کی پرواز میں مبالغہ آمیزی کو حسنِ کلام سمجھا جانے لگا۔ ابن معتز نے لکھا ہے کہ "قصیدہ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں مبالغہ ہو۔ کیونکہ اس سے استعجاب پیدا ہوتا ہے"۔ چونکہ قصیدہ فارسی کو ورثہ میں ملا۔ اسلئے انہوں نے مبالغہ کو غلو کی حد تک پہنچا دیا۔

قصیدے کے چار اجزاء ہوتے ہیں جن میں تناسب اور توافق قائم رکھنا قصیدہ نگار کے لئے لازمی ہے۔

(۱) اوّل **تشبیب** ہے جسے نسیب بھی کہتے ہیں۔ یعنی ابتداء کے چند اشعار جو مضمون کے تعارف کے لئے ہوتے ہیں۔ عربوں کا دستور تھا کہ اس میں وہ اپنی محبوبہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ تشبیب کے معنی ہی حکایتِ شباب یا تذکرۂ شباب ہے۔ ایک عربی قصیدہ لکھنے والا تشبیب لکھنے کا حق ادا کر دیتا تھا۔ کیونکہ اس میں وہ اپنی زندگی اور عشق کی

داستان کہتا تھا۔ عشق کی داستانوں کے علاوہ 'فارسی والے' بہار کے متعلق بھی شعر کہتے تھے۔ یا کوئی اخلاقی مضمون بیان کرتے تھے۔ فارسی کے قصائد نگار منوچہری۔ فرخی نے معرکے کی تشبیب لکھی ہیں۔ اسی طرح طالب آملی کلیم۔ نظیری اور قاآنی نے کچھ کم حق ادا نہیں کیا۔ لیکن تشبیب کا مقصود بالذات "ذکرِ محبوب کردن" یا بہار کی توصیف بیان کرنا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ آئندہ مضمون کے لئے ایک مناسب پس منظر بیان کرنا ہوتا تھا۔

(۲) دوم گریز ہے۔ یہ ایک لطیف طریقہ ہے جو پہلے مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف آنے کا ہے۔ عربی میں اسے تخلص کہتے ہیں۔ یعنی "رہائی پانا"۔ اس کے لئے ایک یا دو شعر لائے جاتے تھے۔ اور "خروج از یک مضمون بہ مضمون دیگر" ہو جاتا تھا۔ یہی وہ تخلص یا "نام شاعر" ہے جو آج بھی غزل کے ساتھ باقی رہ گیا ہے۔ کیونکہ ایک زمانہ کے بعد تشبیب ہی "غزل" بن کر اس صنف سے علیحدہ ہو گئی۔ فارسی قصیدوں کی ابتداء میں (یعنی غزنویوں کے عہد میں) جب شاعر گریز کرتا تھا تو اس میں جہاں ممدوح کا نام بولا جاتا تھا وہاں وہ اپنا نام بھی ساتھ لے آتا تھا۔ تشبیب کے لئے قصیدہ کا جو عام مضمون یعنی "مدح" ہے اگر گریز کے ساتھ متناسب اور ہم آہنگ ہو تو جہاں قصیدے کی ابتداء انشراحِ قلب کا سبب اور کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے وہاں گریز کی لطافت ممدوح کی مسرت کا باعث بنتی ہے اور خاتمۂ کلام کی لئے اس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ہمیں بہادر شاہ کی صحت یابی پر ذوق کے قصیدے میں ملتی ہے۔ گریز کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ پڑھنے والے کو یہ معلوم نہ ہو کہ شاعر نے کوئی تکلف کیا ہے یا کوئی معمہ پیدا کر دیا ہے۔ بلکہ گریز کے وقت نہایت آسانی سے دوسرے مضمون میں جانا چاہیئے۔

(۳) سوم مدح۔ قصیدے کا عام مضمون مدح ہے۔ اور مدح وہی قابلِ تعریف ہے جس میں ایسے اوصاف بیان کئے جائیں جو اصلی ہوں۔ یعنی ان کے اندر خلوص۔ واقفیت اور اصلیت ہو۔ مثلاً ممدوح اگر کوئی مقدس اور پارسا شخص ہے تو اس کے لئے تشبیب رندانہ اور عاشقانہ تناقض ہے۔ پس ایسے وجود کی مدح جو اسکے لائق نہ ہو۔ قصیدے کے احاطہ سے باہر ہے۔ قصیدہ کو جدید نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور مدح میں بیان کردہ اوصافِ شخصی اور اخلاقِ ذاتی کو اگر جمع کیا جائے تو ہمیں انسان۔ انسان نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایک مہیب اور بالا شخصیت کی تصویر نظر آتی ہے اسلئے ہم اسے عیب تصور کرتے ہیں۔ ہمارے شعراء نے گھوڑے اور ہاتھی کا جہاں وصف بیان کیا ہے بڑی اچھی تصویر پیدا کی ہے۔ اس میں شاعر کی وسعتِ مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور زورِ تخیل کا پتہ لگتا ہے۔

(۴) چہارم آخری جزو دُعا یا خاتمہ ہے۔ قصیدہ کے آخر میں ممدوح کے لئے دُعا کی جاتی ہے۔ اس کے اشعار عام طور پہ نہایت مترنم ہوتے ہیں جسے سُن کر سامع یا قاری محظوظ ہوتا ہے۔ دُعائیہ اشعار سے ذرا پہلے آخری چیز

"حُسنِ طلب" ہے۔ بعض اوقات یہ "حسنِ طلب" تقاضہ کا رنگ بھی اختیار کر جاتا ہے۔ ایک اچھے قصیدے کا پہلا اور آخری شعر نہایت معیاری ہوتا ہے۔ قصیدے کی ظاہری ہیئت کے علاوہ دیگر اوصاف میں سے قصیدے کی زبان میں شوکت، طمطراق، خروش اور جزالت کا ہونا ضروری ہے۔ قصیدے کی وجہ سے اسالیبِ بیان اور زبان کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ لیکن دُوسری طرف اس سے نقصان یہ پہنچا ہے کہ یہ خوشامد۔ چاپلوسی اور دربار داری کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ادب کا رجحان مبالغہ پسندی۔ تخیل۔ نازآفرینی۔ تزئین کی طرف ہوگیا ہے۔ گویا کہ بقول حسرت موہانی ؎

یُوں کہہ رہے ہیں قصّۂ فرہاد بار بار
گویا سوجھا رہے ہیں طریقِ وفا مجھے

حقیقت تو یہ ہے کہ قصیدے کا دَور مغلوں کے دورِ حکومت کے بعد ختم ہوچکا ہے۔ اور موجودہ جمہوریت اور عوامیت کے زمانے میں اگر کسی کو لائقِ مدح کا درجہ دیا جائے تو کس کو؟ البتہ مذہبی رہنماؤں اور روحانی پیشواؤں کے حضور اگر خدا تعالیٰ کی شکرگذاری کے طور پہ نذرانۂ جذبات و دل پیش کیا جائے تو حرج نہیں۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
مَیں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

○

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
مَیں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

(اقبال)

○

عطاء المجیب راشد
(ایم اے عربی فائینل)

تدوینِ حدیث

محدثین اُمّت کی مساعیٔ جلیلہ کا تذکرہ

قرآن کریم بنی نوع انسان کی ہدایت کا سرچشمہ ہے جس میں تمام اصولی باتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قرآن ہی کو اسلام کی بنیاد کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ اور ساری عمر اس کے مطابق عمل کر کے اُمّت کے لئے اپنا اسوۂ حسنہ بطور ورثہ چھوڑا۔ حضور کے یہ اعمال بھی مسلمانوں کیلئے راہ صواب متعین کرتے ہیں۔ تیسرے درجہ پر ان فرمودات و ارشادات کو دلیلِ راہ قرار دیا گیا ہے جو ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلّم کی لب کشائی سے اُمّتِ مرحومہ کے دامن میں آئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کا خلاصہ وہ ہے جو آپ کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ کان خُلقُہُ القرآن۔ یہ بات شک و ارتیاب سے بالا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیات طیبہ میں قرآن کی قولی و عملی تفسیر ہے اور آپ کے ان ہی اقوال، اعمال اور احوال کو حدیث کا نام دیا جاتا ہے۔

حدیث عربی لفظ ہے اور عربی زبان میں اس کا قریباً وہی مفہوم ہے جو ہم اُردو میں گفتگو، کلام یا بات کے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ حدیث کے معنے نئی بات کے بھی کئے گئے ہیں۔ آغازِ اسلام سے قبل یہ اصطلاح عام تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد کے بعد اس کا مفہوم متعین ہوگیا۔ اب صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کو حدیث سمجھا جانے لگا۔ آپ مبلّغ اور معلّم کتاب و حکمت تھے۔ اِس حیثیت سے آپ کا کام احکام الٰہیہ کی وضاحت تحلیل و تحریم کی صراحت اور تمام امور دینیہ و دُنیویّہ میں اپنے جاں نثار صحابہ کرامؓ کی ہدایت تھا۔ چنانچہ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم گفتگو اور بات کے ذریعہ پیام الٰہی لوگوں تک پہنچاتے۔ تقریر اور کلام کے ذریعہ کتاب اللہ کی تفسیر فرماتے۔ خود ان احکامات پر عمل کر کے دکھاتے نیز صحابہؓ کو اس کی تلقین کرتے۔ اور جب صحابہؓ کو کوئی غلطی کرتے ہوئے دیکھتے تو فوراً محبت و شفقت سے روک دیتے۔ اگر نہ روکتے تو اُسے بھی آپ ہی کی مرضی پر محمول کیا جاتا۔ اور ان سب امور کے مجموعہ کا نام احادیث ہوا۔ جن کو تین قسموں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۔ حدیث قولی ——— جس میں حضور کے کسی واضح قول کا بیان ہو۔
۲۔ حدیث فعلی ——— جس میں حضور کے کسی کام کرنے کا ذکر ہو۔
۳۔ حدیث تقریری ——— جس میں یہ بیان ہو کہ حضور کے سامنے کوئی کام کیا گیا، یا بات کہی گئی اور حضور نے اس کو کسی طور سے ناپسند نہ فرمایا۔

حدیث کی اہمیت جاننے کے لئے اس آیت کریمہ پر غور کرنا کافی ہوگا کہ:۔

وما آتکم الرّسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا (سورہ حشر رکوع ۱)

جس کی مزید وضاحت کے طور پر یہ آیات بھی پیش کی جاسکتی ہیں کہ:۔

ومن یُطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ (النساء رکوع ۱۱)

لَقَدْ کان لکم فی رَسولِ اللّٰہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب رکوع ۳)

اور وَمَا ینطق عن الھوی۔ ان ھو اِلّا وَحیٌ یُوحٰی (النجم رکوع ۱)

حدیث کی ضرورت اور اہمیّت سے اس وجہ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بے شمار مسائل اور احکامِ شرعیہ ایسے ہیں جن کی وضاحت صرف اور صرف احادیث میں ملتی ہے۔ اگر یہ وضاحت نہ ہو تو اُمّتِ مسلمہ کے لئے دین حنیف کی تعلیم پر صحیح طریق پر عمل کرنا بہت مشکل ہو جائے۔ علاوہ ازیں حدیث کی فرضیّت کے بارہ میں حضور کی یہ حدیث بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ:۔

اِنّی اُتیتُ القراٰنَ و مثلَہٗ مَعَہٗ۔ (کنز العمال بحوالہ ابو داؤد کتاب السنہ)

کہ مجھے قرآن کے ساتھ اس جیسا اور کلام بھی دیا گیا۔

الغرض ان تمام اقوال سے حدیث کی عظمت، اہمیّت اور فرضیّت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ احادیث ہدایت کا وہ خزانہ ہیں جن کا انکار شقاوتِ قلبی اور کفرانِ نعمت کا آئینہ دار ہے۔

حدیث کے اس مختصر سے تعارف کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کی تدوین کا کام کب شروع ہوا اور کن حالات میں اور کس کس طریق سے اس نے تکمیل کے مراحل طے کیے۔

متعدد مصنّفین نے اس خیال کو اپنایا ہے کہ تدوینِ حدیث کا کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے قریباً ایک سو سال بعد شروع ہوا ہے۔ ان کا قول اس حد تک تو درست ہے کہ حدیثوں کی باقاعدہ تدوین یعنی ان کی کتب مدوّن کرنے کا کام تو بیشک کم و بیش اسی زمانہ میں شروع ہوا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا سخت غلطی ہوگی کہ اس سے قبل حدیثیں محفوظ نہ تھیں اور اسی وقت ان کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں ہی اور آپ کے سامنے ہی لکھی جانی

شروع ہو چکی تھیں۔

وہ لوگ جو حدیثوں کی تدوین کے کام کو ایک صدی کے قریب مؤخر بتاتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ عہدِ رسالت میں تعلیم و تدریس کا رواج نہ تھا اِس وجہ سے بھی حدیثوں کے لکھے جانے کا کم امکان ہے۔ لیکن یہ خیال بھی سطحی نوعیت کا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم میں عرب کی قوم کو اُمّیین قرار دیا گیا ہے اور النبی الاُمّی ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خصوصی صفت ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا سخت نادانی ہے کہ اس دور میں کوئی شخص بھی پڑھا لکھا ہُوا نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بھی لکھنے پڑھنے کا رواج موجود تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ اس کو قلمبند کروا دیتے تھے۔ اسی زمانہ میں حضرت علی رضؓ نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھا۔ حضور نے وقت کے بادشاہوں کو تحریراً اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ پھر عرب لوگ فحول شعراء کا بلند پایہ کلام خانہ کعبہ کے پردوں سے لٹکایا کرتے تھے۔ نہ صرف تعلیم و تدریس کا رواج ہو رہا تھا بلکہ اس کو قدر اور جستجو کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسیرانِ بدر کو دس دس غلاموں کی تعلیم کے فدیہ کے عوض آزاد کیا گیا تھا۔

حدیث کی تدوین کو مؤخر بتانے والوں کی اسی دلیل کا ایک پہلو یہ ہے کہ عرب لوگوں کا حافظہ بہت غضب کا تھا جس کی وجہ سے وہ لکھنے کی طرف توجہ نہ دیتے تھے بلکہ ہر بات اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے تھے۔ اسی دلیل کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کتاب تمدّنِ عرب از احسان الحق صـ۱۷۶ پر لکھا ہے کہ

عرب لوگ "اشیاء کو کاغذ کے حوالے کرنا ضائع کرنے کے مترادف سمجھتے تھے"۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

استودع العلم قرطاسًا فضیّعه
وبئس مستودع العلم القراطیس"

پھر یہ امر بھی اُن کے ہاں مسلّم تھا کہ ان العرب قد خصّت بالحفظ۔

چنانچہ عرب حفظ پر فخر کرتے تھے۔ کتابت پر بھروسہ کرنے سے اُن کو قوتِ حفظ کمزور ہو جانے کا خطرہ تھا۔

عربوں کا حافظہ واقعی ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ابتدائے اسلام کے جس دور کا ذکر ہو رہا ہے اس میں اگرچہ اکثر صحابہؓ کا طریق عمل یہی تھا کہ حضورؐ کے ارشادات کو زبانی یاد رکھا جائے لیکن اس طریق کے پہلو بہ پہلو ہم کتابتِ حدیث کا دستور بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ پس محض قوتِ حافظہ کی وجہ سے کتابتِ حدیث سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ جب اسلام کا آغاز ہُوا اور اسکے ساتھ ہی قرآن مجید کا نزول شروع ہُوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس بات کا خطرہ تھا کہ صحابہ کرام جن کی چشمِ بصیرت ابھی اس حد تک نورِ ایمان سے

روشن نہ ہوئی تھی کہ خداتعالےٰ کے کلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں فرق سمجھ سکے وہ غلطی سے قرآن مجید اور احادیث کو خلط ملط نہ کردیں۔ چنانچہ یہ وہ بالکل ابتدائی اور مختصر سا زمانہ ہے جس میں صحابہ کرامؓ نے اپنے حافظوں سے کام لیا اور حدیثوں کو نہ لکھا۔ اس وقت میں یہ صرف زبانی روایت کی جاتی تھیں صحابہ کا یہ طریق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل قول کی بناء پر تھا جس کی روایت صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ نے اس طرح کی ہے کہ حضور نے فرمایا:۔

لا تکتبوا عنّی ومن کتب منی غیر القرآن فلیمحہ حدّثوا عنی ولاحرج ومن کذب علیّ متعمدًا فلیتبوّأ مقعدہ من النار۔ (باب التثبت فی الحدیث وحکم کتابۃ العلم)

کہ مجھ سے کچھ نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھ لیا ہے تو وہ اسے مٹا دے۔ اور مجھ سے حدیثیں بیان کرو اس میں کچھ حرج نہیں۔ اور جس شخص نے میرے متعلق قصدًا جھوٹ بولا۔ اُسے چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ کتابتِ حدیث کی مخالفت صرف اس وجہ سے کی گئی تھی کہ قرآن مجید کی حفاظت میں کوئی خلل نہ ہو اور نہ کسی قسم کا شک پیدا ہونے کا کوئی امکان رہے۔ چنانچہ مسند احمد میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی یہ روایت درج ہے کہ ایک دن ہم بیٹھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال تحریر کر رہے تھے کہ آپ تشریف لائے۔ اور پوچھا کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ آپ کے ارشادات۔ فرمایا کتاب اللہ کے ساتھ ایک اور کتاب لکھ رہے ہو؟ کتاب اللہ کو خالصًا لکھو۔ اس میں کوئی آمیزش نہ کرو۔ صحابہؓ نے جب یہ حکم سنا تو ایسی تمام تحریریں اکٹھی کر کے جلا دیں۔ حضرت ابنِ مسعودؓ سے بھی اسی مضمون کی روایت آتی ہے۔ اور ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف قرآن کریم میں آمیزش کا امکان تھا بلکہ اگر نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بروقت توجہ نہ دلاتے تو عین ممکن تھا کہ صحابہؓ اس غلطی کا ارتکاب کر لیتے۔ الغرض اسی خطرہ کے پیشِ نظر حضورؐ نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا تھا اور یہ ایسا امر ہے جس کی وجہ سے حجیّتِ حدیث سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس ابتدائی دور کے گزرنے کے بعد جب صحابہؓ میں علم و ادب کا رواج بڑھنے لگا۔ لکھنے پڑھنے کا دستور عام ہونے لگا۔ اور ان کے دینی فہم و ادراک میں بھی ترقی ہوگئی۔ تو پھر اس اختلاط کا خطرہ نہ رہا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت میں یہ ارشاد فرمایا کہ: "بلّغوا عنّی و لو آیۃً"

کتابتِ حدیث کی اجازت کا ذکر بڑی صراحت سے ملتا ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ:۔

کان رجل من الانصار یجلس الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث فیعجبہ ولا یحفظہ فشکا ذالک

الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فقال یارسول اللہ انی لا سمع منك الحدیث فیعجبنی وَلا احفظهٗ فقال رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم استعن بیمینك و اَوْمأ بیدهٖ للخط۔

کہ ایک انصاری صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت اقدس میں بیٹھتے آپ کی باتیں سُنتے اور بہت پسند کرتے مگر یاد نہ رکھ پاتے۔ آخر انہوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے کی کہ یارسول اللہ میں آپ سے حدیث سُنتا ہوں وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے مگر اسے یاد نہیں رکھ سکتا۔ اِس پر آپ نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو۔ اپنے دستِ مبارک سے ان کو لکھنے کی طرف اشارہ کیا۔

اسی طرح حضرت رافع بن خدیجؓ بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے خدمت نبوی میں گذارش کی کہ :۔

یارسول اللہ انا نسمع منك اشیاء فنکتبها۔

کہ یارسول اللہ ہم آپ کی فرمودہ باتیں سُن کر لکھ لیتے ہیں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا :۔

اکتبوا ولا حرج ۔ کہ لکھ لیا کرو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

سنن ابی داؤد اور مسند دارمی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے اپنی روایت بیان کی ہے کہ مَیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے کے لئے اس کو لکھ لیتا تھا۔ پھر قریش نے مجھ کو منع کیا۔ اور کہنے لگے کہ تم جو بات سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بشر ہیں غصہ میں بھی کلام فرماتے ہیں اور خوشی میں بھی۔ یہ سُنکر مَیں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے اِس کا ذکر کیا تو آپ نے انگشت سے اپنے دہان مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمانے لگے :۔

اکتب فَهو الذی نفسی بیده ما یخرج منه الّا حق

کہ تم لکھ لیا کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اِس منہ سے بجز حق کے کچھ نہیں نکلتا۔

پھر مختلف کتب میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا گیا ہے کہ :۔

قیّدوا العلم بالکتاب ۔ کہ علم کو قیدِ کتابت میں لے آؤ۔

حدیثوں کو لکھنے کی اجازت دینے کے علاوہ نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم نے بعض موقعوں پر خود بھی اپنے ارشادات لکھ کر دیئے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے منقول ہے کہ فتح مکّہ کے موقعہ پر

آپ نے ایک خطبہ دیا۔ اسپر یمن کے ایک صحابی حضرت ابوشاہؓ نے اُٹھ کر درخواست کی کہ اکتبوالی یارسُول اللہ۔ آپ نے درخواست منظور فرماکر حکم دیا کہ اکتبوالابی شاہ کہ ابوشاہ کے لئے میرا یہ خطبہ لکھ دیا جائے۔ نیز روایت میں آتا ہے کہ ارشاد و ہدایت کے وقت آپ ہر چیز کو دو یا تین مرتبہ دُہراتے تھے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ اِنَّہٗ اِذَا تَکَلَّمَ بِکَلِمَۃٍ اعادھا ثلثًا۔ (بخاری)

اِسی قسم کے اور بھی متعدد واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے خود اپنے ارشادات لکھوائے۔ یہ سارا ذخیرہ قبائل کو تحریری ہدایات، خطوط کے جوابات، سلاطینِ وقت اور مشہور فرمانرواؤں کے نام اسلام کے دعوت ناموں، معاہدات، صلح ناموں اور امان ناموں کی صُورت میں محفوظ ہے۔

کتابتِ حدیث کے مسئلہ کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم دیکھتے ہیں کہ تدوین حدیث نے کن کن مراحل کو طے کیا ہے۔

"تدوین حدیث کا پہلا دور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیات مبارکہ تک ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے کتابتِ حدیث کی اجازت مل گئی تو صحابہ نے احادیث کو زبانی روایت کرنے کے ساتھ ساتھ تحریر میں بھی لانا شروع کر دیا۔ لیکن اس بارہ میں بہت احتیاط سے کام لیا کہ اوّل: کوئی حدیث قرآن کے ساتھ یا قرآن کی آیت حدیث کے ساتھ نہ مل جائے۔ دوم: کوئی غلط حدیث تحریر میں نہ آجائے یا اس رنگ میں نہ درج ہو جائے کہ اس سے غلط مفہوم اخذ ہوتا ہو۔ صحابہ کرام کی احتیاط کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تقریباً پانچ سو احادیث ایک صحیفہ میں لکھی ہوئی تھیں۔ لیکن پھر یہ فکر دامنگیر ہوا کہ اس میں کوئی غلط روایت نہ آگئی ہو۔ ایک رات صبح تک اسی اضطراب میں رہے اور صبح ہوتے ہی یہ مجموعہ ضائع کر دیا۔

دارمی مسند احمد میں حدیث بیان کی گئی ہے کہ صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے۔ ان میں عبداللہ بن عمروؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کو اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا لیکن انہیں اعتراف تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ مجھ سے زیادہ حدیثیں جانتے تھے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور وہ لکھتے نہ تھے بلکہ اکثر یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس دور میں کچھ ارشادات تو حضورؐ نے خود املاء کروا دیئے اور کچھ صحابہؓ نے اپنے اپنے طور پر محفوظ کیئے۔ اس دور کے تحریری سرمایہ کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہجرت کے دوسرے سال خون بہا کی شرحیں ایک کاغذ پر لکھوا کر تلوار کی نیام میں رکھ لی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک اور تحریر بھی تھی جس میں مندرج تھا کہ جس نے اندھے کو غلط راستہ پر

چلایا۔ قطعات زمین کی علامات چرائیں، غیر موالی سے موالات کی یا جس نے بھلائی کی ناشکری کی اس پر خدا کی لعنت ہے۔

۲۔ کتاب سعد بن عبادہ جس سے آپ کے بیٹے نے روایت کی۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر بن العاصؓ کا صحیفہ جس کا نام انہوں نے صادقہ رکھا تھا اسکی سب احادیث انہوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُن کر لکھی تھیں۔ یہ صحیفہ آپ کے خاندان میں بطور ورثہ چلا آیا اور آپ کے بیٹوں اور پوتوں نے اس سے روایت کی۔

۴۔ وہ خطبہ جو حضورؐ نے حضرت ابو شاہؓ کی درخواست پر اُن کو لکھوا کر دیا۔

۵۔ زکوٰۃ اور دیگر احکام پر مشتمل ایک "کتاب الصدقہ" جو حضورؐ نے خود لکھوائی۔ آپؐ نے یہ نوشتہ اپنے پاس رکھا۔

۶۔ صحیفہ علیؓ جو خود حضورؐ نے حضرت علیؓ کو لکھوایا۔

۷۔ اس کے علاوہ حضرت سمرہ بن جندبؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت طاؤسؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت اسماء بنت عمیسؓ کی کتابیں اہم ہیں۔

غرض تدوین حدیث کے اس پہلے دور میں تدوین کا کام تو ہوا لیکن انفرادی طور پر، غیر منظم طریق پر اور بغیر کسی معیّن اور طے شدہ پروگرام کے ہوا۔ پھر بھی احادیث اس طور پر محفوظ ہوگئیں کہ بعد میں انہی کتب کو بُنیاد بناکر کام کو وسعت دی گئی۔

تدوین حدیث کا دُوسرا دور وصال نبوی سے پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک ہے۔ یہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کبار کا دور ہے۔ اس دور میں صحابہ کرام نے خود محنت کرکے اور تابعین نے ان صحابہ سے استفادہ کرکے حدیثوں کے موجودہ ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ کیا۔ جس کی کسی قدر تفصیل یہ ہے۔

۱۔ سنن دارمی میں بشیر بن نہیک سدوسی سے جو مشہور تابعی ہیں منقول ہے کہ:۔

"میں حضرت ابو ہریرہؓ سے جو حدیثیں سُنتا لکھ لیتا تھا۔ پھر جب مَیں نے اُن سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا تو اس کتاب کو لیکر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کو اُن کے سامنے پڑھ کر سُنایا اور پھر اُن سے عرض کیا کہ یہ سب وُہی حدیثیں ہیں جو مَیں نے آپ سے سُنی ہیں۔ فرمانے لگے ہاں"۔

اِس طرح بشیر سدوسی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی احادیث کو جمع کر لیا۔

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات سے ہی ایک صحیفہ ہمام بن منبّہ یمانی نے بھی ترتیب دیا۔ جس کو حدیث کی نسبتاً باقاعدہ تدوین میں پہلی کوشش قرار دیا جاتا ہے۔ اِس میں ۱۳۸ احادیث ہیں۔ پورا نام الصحیفہ الصحیفہ ہے اور صحیفہ ہمام بن منبّہ کے نام سے معروف ہے۔ یہ پورا صحیفہ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں یکجا روایت کیا ہے اور اصل نسخہ بھی برلن میں موجود ہے۔

۳۔ مروان نے اپنی امارتِ مدینہ کے زمانہ میں حضرت زید بن ثابتؓ سے کچھ احادیث لکھنے کی خواہش کی لیکن وہ چونکہ کتابتِ حدیث کی طرف زیادہ مائل نہ تھے اس لئے انکار کیا۔ اس پر مروان نے پردہ کے پیچھے کاتب بٹھایا اور خود حضرت زیدؓ سے مسائل دریافت کرتا۔ اس طرح آپ کے اقوال کو جو احادیث النبیؐ پر مشتمل تھے، کاتب ریکارڈ کرتا چلا جاتا تھا۔

۴۔ حضرت سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثیں لکھیں اور رخصت ہونے سے قبل سُنا کر توثیق حاصل کی۔

۵۔ اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، سعد بن عبادہؓ، عبداللہ بن ابی اوفیؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی احادیث کے بعض مجموعے تیار کیئے۔ صحابہ ایک دوسرے کو ضرورت کے وقت احادیث لکھ کر دیتے تھے۔

۶۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ نے جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے کثیر تعداد میں روایات بیان کی ہیں۔

تدوین حدیث کا تیسرا دَور ۱۰۰ سن ہجری سے ۱۵۰ سن ہجری تک ہے۔ اس دَور میں تدوین حدیث کی طرف پہلے سے بہت زیادہ توجّہ دی گئی اور عملاً کام بھی کافی ہُوا۔

اس دور کی ابتداء اس حالت میں ہوئی کہ خورشید نبوت سے براہ راست اکتساب نور کرنے والے اکثر ستارے غروب ہو چکے تھے اور جو باقی تھے وہ بھی آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ عہدِ نبوت سے بُعد بڑھتا جا رہا تھا۔ اور اسلامی مملکت کی سرحدیں وسیع سے وسیع تر ہو رہی تھیں۔ نومسلموں کی کثرت کی وجہ سے طلب علم اور استحقاقِ حق کی جستجو بڑھ رہی تھی۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اسانید کے واسطے بڑھ رہے تھے۔ خود اپنی نظروں سے دربارِ جلالت پناہ کی عظمت و شوکت اور ہادیٔ برحق کے اسوۂ حسنہ کو دیکھنے والے خوش قسمت صحابہ کا وجود عنقا صفت ہوتا جا رہا تھا۔ جب کوئی جلیل القدر صحابی کوچ کرتا تو تابعین کو اپنی محرومی کا شدید احساس ہوتا۔ چنانچہ "امام ابن ماجہ اور علم حدیث" میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت انس بن مالکؓ کا انتقال ہُوا تو مورق کہنے لگے کہ :-

ذھب الیوم نصف العلم۔ کہ آج دنیا سے نصف علم اُٹھ گیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب لوگوں میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا تو فوراً ان صحابہ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ چنانچہ صحابہ کی موجودگی میں اہلِ بدعت کا زور نہ چلتا تھا۔ صحابہ کی شہادت کے بعد فتنہ فوراً دب جاتا تھا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری صحابی ۱۱۵ ہجری میں فوت ہوئے تھے۔ چنانچہ اس دَور میں جب

صحابہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے تو منافقین کو اس بات کا موقعہ مل گیا کہ وہ وضعی احادیث پیش کر کے اسلام میں رخنہ اندازی کریں۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور میں وضعی حدیثوں کا کاروبار بڑی ترقی کرنے لگا۔ جس کی وجہ سے اُمت کے بزرگوں کو خدشہ ہُوا کہ کہیں ہدایت کا یہ ذریعہ اختلاط و آمیزش کا شکار ہو کر ناقابل اعتماد نہ رہ جائے۔ چنانچہ ان حالات میں تدوین حدیث کے کام کو باقاعدہ منظم کیا گیا اور فنِ حدیث کی ابتداء ہوئی جس کے ساتھ احادیث کے صحیح مرتبہ کی تعیین، جرح اور تعدیل وغیرہ علوم کا بھی آغاز ہُوا۔

اس دَور میں تدوین حدیث کے سلسلہ میں شاندار خدمات بجالانے کا سہرا بنو امیہ کے نیک دل بزرگ اور صالح خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے سر ہے۔ جو ۹۹ ہجری میں خلیفہ ہوئے۔ جب آپ نے احادیث کی عظمت و توقیر کو منافقین کی وضعی احادیثوں اور ناپاک عزائم میں گھرے ہوئے دیکھا تو آپ نے فوراً تمام ممالک کے علماء کے نام فرمان بھیجا کہ حدیث نبوی کو تلاش کر کے جمع کر لیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابو نعیم اصفہانی تاریخ اصفہان میں روایت کرتے ہیں کہ :-

کتب عمر بن عبد العزیز الی الآفاق انظروا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ۔

کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے تمام آفاق میں لکھ بھیجا کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر کے جمع کرو۔

اس سلسلہ میں آپ نے مدینہ کے قاضی ابو بکر حزمی کو جو فرمان بھیجا اس کا مؤطا امام محمد میں ذکر ملتا ہے۔ آپ کے اس فرمان پر فوراً عمل کیا گیا۔ چنانچہ جامع بیان العلم میں سعد بن ابراہیم سے روایت ہے کہ جب ہم کو عمر بن عبد العزیز نے جمع حدیث کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کی دفتر حدیثیں لکھیں اور انہوں نے ایک ایک مجموعہ ہر جگہ جہاں انکی حکومت تھی بھیج دیا۔

اس تیسرے دَور میں حدیث کے متعدد مجموعے لکھے گئے جن کی کسی قدر تفصیل یہ ہے :-

۱- مدینہ کے قاضی ابو بکر حزمی نے حدیث میں متعدد کتابیں لکھی تھیں لیکن جب قاضی صاحب کا یہ کارنامہ پایہ تکمیل کو پہنچا تو حضرت عمر بن عبد العزیز وفات پا چکے تھے۔ یہ کتب اب موجود نہیں ہیں۔

۲- امام شہاب زہری نے بھی احادیث جمع کیں اور آپ کے مجموعہ کی بھی نقلیں کرا کر ممالک محروسہ میں بھجوائی گئیں۔ اِس طرح آپ کے مجموعہ کو قاضی ابو بکر حزمی کے مجموعہ پر اوّلیت کا امتیاز حاصل ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس شخص نے سب سے پہلے علم حدیث مدوّن کیا وہ امام شہاب زہری ہیں۔ یہ قول صرف اِس حد تک درست ہے کہ امام موصوف نے باقاعدہ تدوین کا آغاز کیا ورنہ احادیث کے مجموعے تو اس سے قبل بھی موجود تھے۔

۳- اس کے علاوہ اس دَور میں امام شعبی اور امام مکحول دمشقی نے بھی تدوین حدیث کا کام کیا اور چند مجموعے

مرتب کیئے۔ ان کے مجموعوں کی خوبی یہ تھی کہ ان میں احادیث ابواب کی ترتیب سے درج تھیں۔ گویا تبویب کی ابتداء کا سہرا انہی علمائے کوفہ کے سر ہے۔

۴۔ اس دور کی ایک اہم تصنیف کتاب الآثار ہے جو حضرت امام ابو حنیفہؒ نے دوسری صدی ہجری کے ربع ثانی میں تالیف کی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا باعث یہ امر ہے کہ اس میں سب سے پہلے احادیث کو کتب اور ابواب میں تقسیم کیا گیا اور ان ابواب کی تقسیم فقہ کے مطابق کی۔ اس سے قبل جتنے بھی احادیث کے مجموعے تھے۔ ان میں احادیث کیف ما اتفق جمع کی گئی تھیں۔ اس کتاب کو احادیث صحیحہ کی پہلی باقاعدہ مدوّن کتاب قرار دیا جاتا ہے۔

۵۔ اس دور کی سب سے اہم اور مقبول کتاب مؤطا امام مالک ہے۔ حضرت امام مالک بن انسؓ بہت ذہین اور قوی حافظہ کے مالک تھے۔ علم حدیث میں شہرت رکھنے والے گھرانہ کے چشم و چراغ تھے۔ مؤطا حدیث کے ساتھ فقہ کی بھی کتاب ہے۔ فقہی ابواب میں منقسم ہے۔ ابتداء میں یہ ۱۰ ہزار احادیث پر مشتمل تھی لیکن امام صاحب نے اس کو بتدریج مختصر کر دیا اور اب اس میں صرف ۱۷۲۰ احادیث ہیں جن میں سے ۶۰۰ معروف، ۶۱۳ موقوف۔ ۲۸۵ مرسل ہیں۔ تدریجی ترمیم کی وجہ سے مؤطا کے کئی نسخے رائج ہو گئے۔ اس وقت دو نسخے رائج ہیں۔ ایک مؤطائے محمد جو انکے مشہور راوی امام محمد کا ہے۔ دوسرا نسخہ جو بالعموم مؤطائے مالک کہلاتا ہے، ان کے شاگرد یحییٰ بن یحییٰ اندلسی کا روایت کردہ ہے۔ حافظ سیوطی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ امام انس بن مالک نے مؤطا کی ترتیب میں امام ابو حنیفہؒ کی پیروی کی ہے۔ اس لحاظ سے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مؤطا کو کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے۔ مؤطا امام مالک میں بلند پایہ احادیث جمع کی گئی ہیں۔ بعض لوگوں نے مؤطا کو صحیح بخاری پر بھی افضلیت دی ہے اور بعض نے ان دونوں کو ہم پلّہ قرار دیا ہے لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ تاہم مؤطا کے تقدم زمانی کی افضلیت مسلّم ہے اور اس کو ثقہ احادیث کے مجموعہ کی بناء پر اُمّت مسلمہ میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا کیونکہ یہ کتاب تو علم حدیث میں ایک تمہید کے طور پر تھی جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے۔

قریباً اسی زمانہ میں جو چوتھے دور کے ابتدائی سالوں پر بھی مشتمل ہے۔ امام اوزاعی۔ امام سفیان ثوری۔ ابن جریج۔ ابی عروبہ۔ ابو سلمہ حماد بن دینار۔ عبداللہ بن مبارک اور معمر بن راشد نے بھی تالیفات کیں جن میں سے سفیان ثوری کی جامع نسبتاً زیادہ اہم ہے۔

تدوین حدیث کا چوتھا دور ۱۵۰ ہجری سے لیکر ۴۵۰ ہجری تک ہے۔ یہ سب سے اہم اور قابلِ قدر دور ہے کیونکہ اس میں محدثین نے دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان مارا اور ایک ایک قریہ میں پہنچکر منتشر اور پراگندہ

روائیتوں کو یکجا کیا۔ مسند حدیثیں علیحدہ کیں۔ صحتِ سند کا التزام کیا۔ فن اسماء الرجال کی تدوین ہوئی۔ جرح وتعدیل کے فن نے مستقل حیثیت حاصل کی اور صحاح ستہ جیسی گرانقدر تالیفات ہوئیں۔

سلطنت اسلامیہ کی وسعت اور لوگوں کے شرق وغرب میں پھیل جانے کے سبب تدوین حدیث کا کام مشکل ہوگیا۔ اس وجہ سے اس دور میں محدثین کو ایک ایک حدیث کی تلاش میں سینکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر کرنا پڑا۔ پھر زمانہ نبوی سے بُعد بڑھ جانے کے سبب سند کا سلسلہ بھی طویل ہوگیا۔ اس سند کو مکمل کرنے اور پھر صحت کا اہتمام کرنے کا کام بھی کافی دِقّت طلب تھا۔ اس جہت سے حدیث کی حفاظت کرنے کے لئے فن اسماء الرجال کی بنیاد رکھی گئی۔ اس فن کا مطلب یہ تھا کہ جن لوگوں کا ذکر کسی سند میں آیا ہو۔ ان کے بارہ میں مکمل معلومات حاصل کی جائیں۔ ان کی زندگی، حالات، کردار، سیرت، سفر، قیام، تعلیم، حافظہ، ذہانت، شیوخ سے ملاقات، وفات وغیرہ امور کا معلوم کرنا اِس فن میں شامل تھا۔ یہ بہت کٹھن کام تھا۔ لیکن محدثین نے اپنی عمریں اِس کام میں صرف کردیں۔ اِس فن کی بدولت احادیث کی صحت و بطلان کا فیصلہ کرنا آسان ہوگیا۔ نیز احادیث کے بارہ میں بہت سی نئی اصطلاحات بھی عالم وجود میں آئیں۔

تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ ڈیڑھ لاکھ اشخاص کے حالات جمع کئے گئے تھے جن سے یہ معلوم کرنا آسان ہوگیا کہ کون راوی اعتبار کے قابل ہے اور کون نہیں۔ ایک مستشرق ڈاکٹر سپرنگر نے فن اسماء الرجال کی اہمیت کا یوں اقرار کیا ہے:-

"پانچ لاکھ انسانوں کی تاریخ محض ایک آدمی کی تاریخ کے لئے اسماء الرجال کے نام سے جمع کی گئی"

اِس دور میں فن جرح وتعدیل اور تنقید احادیث کا بھی آغاز ہوا۔ اِس فن کی ضرورت کا احساس اِس وجہ سے پیدا ہوا کہ اس دور میں احادیث کی بے انتہاء کثرت ہوگئی۔ ہر علاقہ اور ہر طرز فکر کی احادیث جمع ہونے لگیں۔ صحابہ اور تابعین سے متعدد لوگ روایت کرنے والے تھے۔ اس وجہ سے بعض روایات کی اسانید سَو سَو سے بھی زیادہ ہونے لگیں۔ فن اسماء الرجال کے وجود میں آنے سے اب بعض اسانید کو دوسری اسانید پر فضیلت اور تفوّق دیا جانے لگا۔

پھر اس فن کی ابتداء کی وجہ وضع حدیث کا زور تھا۔ حدیثیں وضع کرنے کا جو سیلاب حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں شروع ہوا تھا۔ اس نے اس زمانہ میں شدّت اختیار کرلی۔ اس کے کئی اسباب تھے۔

۱- اسرائیلیات کی غیر محتاط اشاعت۔

۲- بے شمار مذہبی فرقوں کا خروج جو اپنے مطلب کے مطابق حدیثیں گھڑ لیتے تھے۔

۳- زندیقیوں کی ناپاک سازش جنہوں نے لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے کیلئے عجیب وغریب احادیث بنادیں۔

۴- قصّہ گو حضرات نے زیب داستان کے لئے احادیث وضع کرلیں۔

۵۔ نسلی عصبیت جس سے متاثر ہو کر قبائل نے اپنے مناقب بیان کرنے کیلئے موضوع احادیث کا سہارا لیا۔
۶۔ شاہانِ وقت کی مدحت سرائی جس کے لئے غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی کو جائز سمجھا گیا اور احادیث وضع کی گئیں۔
۷۔ نمائش علم کی جھوٹی عزّت کا شوق جس نے ناعاقبت اندیش لوگوں کو وضع حدیث کی راہ بتائی۔
۸۔ وقتی ضرورت جس کے پورا کرنے کے لئے انہوں نے احادیث بنالیں اور اپنا اُلّو سیدھا کر لیا۔
۹۔ حصول مقصد کی غلط کوشش جیسے لوگوں کو قرآن مجید کی تلاوت کا شوق دلانے کے لئے سُوَر کی فضیلت میں احادیث بنالیں۔
۱۰۔ بعض اولیاء اللہ کی بے احتیاطی جنہوں نے اپنے کسی کشفی واقعہ کو حقیقت پر محمول کر کے حدیث مسموع کے طور پر بیان کر دیا اور لوگوں نے اسے حدیث کا درجہ دیدیا۔

الغرض ان متفرق وجوہات کی بناء پر وضعی حدیثوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ چنانچہ محدثین نے بھی بڑی عرق ریزی سے صحیح احادیث کو تلاش کر کے مختلف کتب میں جمع کیا۔ اس دَور کی تصانیف یہ ہیں :-

(۱) مُصَنَّف عبدالرزاق (متوفی ۲۱۱ ہجری)
(۲) مسند ابوداؤد طیالسی (متوفی ۲۰۴ ھ)
(۳) مُصَنَّف ابوبکر بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ ھ)
(۴) مسند احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ ھ)
(۵) مسند عبد بن حُمَید (متوفی ۲۴۳ ھ)
(۶) مسند حارث بن اسامہ (متوفی ۲۸۰ ھ)
(۷) مسند ابوبکر بزار (متوفی ۲۹۲ ھ)
(۸) مسند اسحٰق بن راہویہ (متوفی ۲۳۸ ھ)

امام احمد بن حنبل کی مسند ان سب کتب سے زیادہ اہم اور مشہور ہے۔ یہ حدیث کا سب سے بڑا مجموعہ ہے جس میں قریباً ۳۰ ہزار احادیث ہیں۔ امام احمد (۱۶۴ ھ - ۲۴۱ ھ) نے اسے ایک میزان قرار دیا تھا کہ جو حدیث اِس میں نہیں وہ بے اصل ہے۔ اس مجموعہ کا غالب حصہ حضرت امام احمد نے خود جمع کیا بعد میں انکے بیٹے عبداللہ نے اپنی روایات اس میں بڑھا دیں جو زیاداتِ عبداللہ کہلاتی ہیں۔ ان کے شاگرد ابوبکر قطیعی نے بھی اپنی مرویات اس میں درج کی ہیں جو زیاداتِ قطیعی کہلاتی ہیں۔

اس دور کا سنہری کارنامہ صحاح ستّہ کی تدوین ہے۔ صحاح ستّہ میں جو کتب شامل ہیں ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری

یہ مجموعہ ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (۱۹۴ تا ۲۵۶ ہجری) کی تالیف ہے اور بالاتفاق کتب حدیث میں سب سے زیادہ اعلیٰ اور قابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ العزیز

ہے۔ امام بخاریؒ کا حافظہ غضب کا تھا۔ آپ نے چھ لاکھ احادیث میں سے ۷۲۷۵ احادیث منتخب کرکے اس مجموعہ کا نام "الجامع المسند الصحیح المختص من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سننہ وایامہ" رکھا۔ یہ کتاب امام موصوف کے طویل سفروں اور سولہ برس کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہے۔

۲۔ صحیح مُسلم

اس کتاب کی تالیف کا سہرا امام مسلم بن حجاج بن مسلم القشیری نیشاپوری (۲۰۶ - ۲۶۱ ہجری) کے سر ہے۔ آپ امام بخاریؒ کے شاگرد تھے۔ آپ نے امام بخاری کے علاوہ امام احمد ابن حنبل اور امام ابن راہویہ سے بھی روایت کی ہے۔ جو حدیثیں بخاری اور مسلم میں مشترک ہیں ان کو "متفق علیہ" کہتے ہیں۔

صحیح مسلم کا رتبہ بہت بلند ہے جس کی سب سے بڑی وجہ صحیح مسلم کی دلکش ترتیب و تبویب ہے۔ بعض لوگ اسے صحیح بخاری سے بھی افضل قرار دیتے ہیں۔ لیکن جمہور علماء نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ امام بخاری کا مرتبہ بہرصورت بلند اور اعلیٰ ہے۔

۳۔ سنن نسائی

اس کتاب کے مؤلف امام ابو عبدالرحمٰن بن شعیب نسائی (۲۱۴ - ۳۰۳ ہجری) ہیں۔ آپ امام ابوداؤد کے شاگرد تھے۔ سنن نسائی میں قوی حدیثوں کی کثرت ہے۔ پہلے آپ نے ایک ضخیم مجموعہ تیار کیا تھا جس کا نام سنن کبریٰ رکھا۔ اسے مختصر کیا اور نام سنن صغریٰ رکھا۔ یہی اب سنن نسائی کے نام سے معروف ہے۔ زیادہ تر احادیث عبادات اور احکام کے بارہ میں ہیں۔

۴۔ سنن ابی داؤد

یہ کتاب امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (۲۰۲ - ۲۷۵ ہجری) کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں ۴۸۰۰ احادیث ہیں۔ دیگر مصنفینِ صحاح ستہ کی نسبت امام ابوداؤد پر فقہی ذوق زیادہ غالب تھا۔ چنانچہ ساری کتاب کی ترتیب فقہی عنوانوں سے ہے۔ کتاب میں بعض ضعیف حدیثیں بھی ہیں جن کی مصنف نے خود نشاندہی کردی ہے۔ امام ابوداؤد امام احمد بن حنبل کے شاگرد تھے۔ سنن ابی داؤد علماء کی نگاہ میں اپنی قیمتی معلومات کی وجہ سے ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے۔

۵۔ جامع ترمذی

یہ کتاب امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (۲۰۰ - ۲۷۵ ہجری) کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ یہ کتاب اپنی جامعیت صحت تحقیق اور تنقید کے اعتبار سے شہرۂ آفاق ہے۔ اس میں مکرر احادیث کم ہیں۔ حاجی خلیفہ مصنف "کشف الظنون" کے نزدیک صحیح بخاری و مسلم کے بعد جامع ترمذی کا درجہ ہے۔ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ

امام ترمذی حدیث کے بارہ میں ذاتی رائے بھی لکھتے ہیں۔

۶۔ سنن ابن ماجہ

اس کتاب کے مؤلف کا نام ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ابن ماجہ قزوینی (۲۰۹ - ۲۷۳ ہجری) ہے۔ آپ کا حافظہ اور معلومات مسلّمہ ہیں۔ اس کتاب میں چار ہزار احادیث جمع کی ہیں۔ اس کتاب کا درجہ صحاح ستّہ میں چھٹے درجہ پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

بعض اصحابِ علم نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا۔ وہ اس کی بجائے مؤطا امام مالک کو یا سنن دارمی کو صحاح ستہ میں شامل کرتے ہیں۔ صحاح ستہ میں سب سے پہلا درجہ صحیحین کا ہے۔ پھر ابو داؤد، ترمذی اور نسائی کا اور تیسرے نمبر پہ ابن ماجہ ہے۔ (صحاح ستہ کے حالات مختصراً لکھے ہیں کیونکہ یہ تفصیلاً کتبِ حدیث سے بآسانی مل سکتے ہیں)۔

صحاح ستہ کے بعد میں آنے والے محدثین میں سے بعض نے چند کتب لکھی ہیں۔ اور بعض زائد احادیث جمع کی ہیں۔ ان کا نظریہ تھا کہ جو احادیث بھی قابلِ قبول نظر آئیں وہ محفوظ کر لی جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر امام ابو یعلیٰ، امام طحاوی، امام ابن حبّان، طبرانی، امام دارقطنی، امام حاکم، امام بیہقی، امام دیلمی اور ابن خزیمہ نے بعض مجموعے لکھے ہیں۔

الغرض اس طرح اُمّت کے اصحاب علم اور محدثین نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کے لبِ مبارک سے نکلا ہوا کوئی فرمان اور ارشاد ضائع نہ ہو۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آج یہ قیمتی جواہرات کتب حدیث میں محفوظ ہیں اور اُمّت مرحومہ کی رشد و ہدایت کا باعث ہیں۔ کاش ہم ان ارشادات کو کتب میں مقید رکھنے کی بجائے اپنے نہاں خانۂ دل میں جگہ دینے کی توفیق پائیں۔

نوٹ: اِس مقالہ کے لکھنے میں خاکسار نے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا:۔

(۱) قرآن مجید
(۲) صحیح بخاری شرح الکرمانی
(۳) تاریخ ادب عربی از احمد حسن زیات
(۴) سیرت عمر بن عبدالعزیز از عبدالسلام ندوی
(۵) تعارف قرآن و حدیث و فقہ از شیخ محمد اقبال
(۶) مجلّہ الجامعہ شمارہ ۴
(۷) امام ابن ماجہ اور علم حدیث از محمد عبدالرشید نعمانی
(۸) مقالاتِ سرسیّد حصّہ اوّل
(۹) تمدّنِ عرب از احسان الحق
(۱۰) شرح صحیح بخاری از مکرم و محترم سید ولی اللہ شاہ صاحب

(عطاء المجیب راشد۔ بی اے)

داؤد طاہر
بی اے سال دوم

روشنی اور رفعت کا نشان

"المنار" کے پندرہ سالہ دور کی تاریخ!

مدارس اور کلیات کے قیام کی بڑی غرض تو یہی ہوتی ہے کہ ان میں طلباء کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے انہیں اس طرح متعارف کرا دیا جائے کہ جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھیں تو زندگی کی گوناگوں مشکلات دیکھ کر گھبرا نہ جائیں اور ان کے قدم متزلزل نہ ہوں بلکہ ہر مشکل کا مقابلہ وہ بڑے بہادرانہ طریق سے کر سکیں اور جہاں بھی ضرورت پڑے اپنے مافی الضمیر کو نہایت عمدہ و احسن طور پر پیش کر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے سکولز اور کالجز میں جہاں مختلف مجالس (Societies) طلباء کو لوگوں کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کی راہ میں حائل ہچکچاہٹ کو رفع کرنے میں کوشاں ہوتی ہیں وہاں ان کی دیگر خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے ان میں قوتِ تحریر پیدا کرنے کیلئے اکثر کالجوں اور بعض سکولوں نے اپنے اپنے جرائد کا اجراء کیا ہوتا ہے۔

المنار[1] کی اشاعت کے پس پردہ بھی یہی مقصد کارفرما تھا کہ اسے ادبی دنیا بنانے کی بجائے تعلیم الاسلام کالج کے طلباء کی ترجمانی کا فرض سونپا جائے جس میں لکھنے کا اولین حق طلباء کو ہی حاصل ہو۔ اور اس میں ان کی تحریریں ہی، گو وہ بلند پایہ کہلانے کی مستحق نہ بھی ہوں، جگہ حاصل کریں ــــ اس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ فن خواہ کوئی ہو اس میں کمال آہستہ آہستہ ہی حاصل ہوتا ہے ــــ حصولِ کمال کے لئے جد و جہد مسلسل اور مناسب حوصلہ افزائی و قدر دانی چولی دامن کے ساتھی ہیں۔ اور پھر فن تحریر میں ترقی حاصل کرنے کے لئے یہ لوازمات تو خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

---

[1] المنار عربی زبان کا لفظ ہے۔ اردو میں عام طور پر اس سے مراد مینار لیا جاتا ہے یعنی ایسی اونچی عمارت ہے جو پھیلاؤ کے لحاظ سے مختصر لیکن بلندی کے لحاظ سے نمایاں ہوتی ہے۔ مگر اصل عربی روٹ (Root) کے لحاظ سے یہ معنی محض ثانوی ہیں۔ کیونکہ المنار کا لفظ نور سے ماخوذ ہے اور اسکے اصل معنے موضع النور یعنی روشنی کے رکھنے کی جگہ اور مقام کے ہیں تاکہ لوگ اسے دیکھ کر رستہ پا سکیں۔ لیکن چونکہ روشنی رکھنے کی جگہ جتنی زیادہ بلند ہوگی اتنا ہی وہ راہگیروں کو راستہ دکھانے اور بھٹکتے ہوؤں کو راہ پر لانے میں زیادہ کارآمد اور زیادہ مؤثر ثابت ہوگی اس لئے لازماً روشنی کی جگہ کو بلند کیا جاتا ہے تاکہ اس کا اثر زیادہ سے زیادہ علاقہ تک وسیع ہو سکے اور اس طرح ثانوی طور پر المنار میں بلندی کا مفہوم بھی شامل ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ المنار کی پیشانی پر "روشنی اور رفعت کا نشان" کے الفاظ درج ہوتے ہیں۔

المنار، جس کا نام جناب غلام علی چودھری صاحب ایم اے[1] نے تجویز کیا تھا[2]، کا پہلا پرچہ، جو اُردو کے ۴۰ اور انگریزی کے ۴۵ صفحات پر مشتمل تھا، کالج کی پہلی کنووکیشن (منعقدہ ۲۔ اپریل ۱۹۵۰ء) کے موقع پر شائع ہوا۔ قمرالانبیاء حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ؓ نے اس کی اشاعت کی خبر پاکر خوشی کا اظہار فرمایا اور "نور کا نشان" کے عنوان سے کالج کے طلباء کو ایک گرانقدر پیغام سے نوازتے ہوئے رقم فرمایا:۔

"اگر ہمارے پروفیسر صاحبان اور طلباء اس رسالہ کو محض ایک کھیل کے طور پر نہیں جاری کر رہے اور انہوں نے اس کا نام دل کی سچی خواہش کے ساتھ چُنا ہے تو اُن کا اوّلین فرض یہ ہے کہ اس رسالہ کو جس کا نام انہوں نے المنار رکھا ہے واقعی اور سچ مچ نُور کا نشان ثابت کر کے دکھائیں۔ یہ رسالہ نہ صرف اپنی ذات میں نور ہو اور ضیاء پاش کرنوں کا مجسمہ بلکہ اس کا نور ایسا بے نقاب اور درخشاں ہو کہ ہر دُور و نزدیک کا شخص اس کی روشنی میں اس طرح رستہ پائے جس طرح کہ چودھویں رات کی چاندنی میں رات کی تاریکی کے باوجود بھولے بھٹکے ہوئے لوگ رستہ پاتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ کوئی کاغذی مینار روشنی کا نشان نہیں بن سکتا جب تک کہ اُسے بنانے والے اور اسے ہاتھوں میں اُٹھانے والے خود نور کا نشان نہ ہوں۔ پس اگر کالج کے میگزین کو حقیقتاً المنار بنانا ہے تو اس کے چلانے والوں کو بھی المنار بننا پڑے گا۔۔۔۔ پھر چونکہ ثانوی طور پر المنار کے مفہوم میں بلندی کے معنے بھی پیدا ہو گئے ہیں اس لئے نور کا نشان بننے کے علاوہ اس رسالہ کا دوسرا مقصد رفعت اور بلندی ہونا چاہیئے۔ المنار کے مضامین کا معیار بلند ہو اور اس کے چلانے والوں کا کیریکٹر بلند تر۔۔۔۔ پس میرا پیغام یہی ہے کہ المنار میں روشنی پیدا کرو اور بلندی اور پھر اپنے آپ میں بھی روشنی پیدا کرو اور بلندی۔ اور آپ کے رسالہ کا بھی عملاً یہی شعار اور ماٹو ہو یعنی ــــ روشنی اور بلندی[3]"

صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب ایم اے (آکسن) پرنسپل کالج نے ان الفاظ میں رسالہ کو پیغام سے نوازا:۔

With trust in God and faith in the ultimate triumph of your mission march on.

ان کے علاوہ جناب شیخ بشیر احمد صاحب (جو اُن دنوں امیر جماعت احمدیہ لاہور تھے) اور جناب جلال الدین صاحب شمس کے پیغامات بھی رسالہ کی زینت بنے۔

---

[1] آپ ان دنوں ہمارے کالج میں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ آپ ہی ہماری کالج سٹوڈنٹس یونین کے بانی ہیں۔ بعدازاں کالج یونین کے انچارج بھی رہے۔ نہایت قابل اور محنتی استاد ہیں۔

[2] حوالہ کے لئے دیکھئے المنار شمارہ ۳ جلد ۲ زیرعنوان بزم المنار۔

[3] المنار جلد ۱ شمارہ ۱

جناب فیض الرحمٰن فیضی ایم اے[1] نگران حصہ اُردو نے ایڈیٹوریل میں لکھا:۔

. . . . ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہماری تاریخ میں یہ پہلا رسالہ ہے جو اس طرز پر چند مخصوص اغراض و مقاصد کو لیکر شائع ہو رہا ہے اور کون جانتا ہے کہ کل یہی المنار سچائی کو اپنے ملک میں پھیلانے کا ذریعہ بن جائے۔

پھر موجودہ نازک و ہیبتناک دَور کی تصویر کھینچتے ہوئے آپ نے اس توقع کا اظہار کیا کہ :۔

اس ماحول اور اس دور میں المنار کی اشاعت ہمارے لئے باعثِ فخر اور باقی دنیا کیلئے موجب رشد و ہدایت ہوگی۔ . . . . (اور) المنار نہ صرف معنوی لحاظ سے بلکہ عملی اور واقعاتی اعتبار سے بھی نور کا نشان اور روشنی اور بلندی کا شعار ثابت ہوگا۔ المنار انسان اور انسان کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام مسائل پر ایک بے لاگ اور بے غرض تنقید ہے۔ اس کا مسلک ایسے ادب اور ایسے علم کو رواج دینا ہے جو انسان کے کام آسکے۔ جو زندگی کو آگے کی طرف قدم بڑھانے میں مدد دے سکے۔

المنار کے مسلک کی مزید وضاحت کئی شماروں میں بار بار کی جاتی رہی۔ چنانچہ جناب محبوب عالم صاحب خالد ایم اے نے اس سلسلہ میں مجلّہ کی جلد ۲ شمارہ ۴ میں لکھا:۔

المنار کو کونسا مسلک اختیار کرنا چاہیئے، ادارہ المنار کے لئے یہ ایک اہم سوال تھا اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اسے ہر پہلو پر غور کرنا تھا۔ طبیعات اور کیمیا، ریاضی اور اقتصادیات، فلسفہ اور تاریخ، وغیرہ مضامین پر گھنٹوں دماغ سوزی کے بعد تھکے ماندے جسموں اور پژمُردہ ذہنوں کے لئے چند لمحوں کی تفریح المنار اپنا منتہیٰ قرار دے یا اس سے بلند تر مقصد — سنجیدہ نظری اور سنجیدہ نگاری جو قارئین المنار کی ذہنی صلاحیتوں کو جِلا دے اور انھیں بروئے کار لائے۔ مقدم الذکر مقصد میں ہمیں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی اسلئے کہ اس کی افادت آنی و لمحی ہے اس لئے ہم نے مؤخر الذکر مسلک اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک تعلیمی ادارہ سے منسوب ہونے والا ماہنامہ ہمارے نزدیک معیاری ہونا چاہیئے جو سنجیدہ نگاری کا مرقع اور علمی تحقیق و تجسّس کا حامل ہو۔ اس لحاظ سے اسے تجارتی رسائل سے ممیز ہونا چاہیئے۔ پھر اس ماہنامہ کے لئے جو تعلیم الاسلام کالج سے منسوب ہو بعض اور امتیازات کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔

---

[1] آپ قادیان کے زمانہ سے اکنامکس کے لیکچرار رہے ہیں۔ لاہور کے قیام کے دوران آپ اس کالج کو الوداع کہہ کر ایف سی کالج لاہور سے وابستہ ہوگئے۔ ہاکی کلب کے صدر اور بعض دیگر انتظامی کاموں پر متعین رہے ہیں۔

تعلیم الاسلام کالج ایک اہم مقصد کیلئے معرض وجود میں آیا ہے ـــــ جدید علوم کی ترویج و تعلیم اسلامی نظریات کے پس منظر میں ـــ مقصد عالی اور منزل کٹھن ہے جو سعی پیہم اور جہد مسلسل کی مقتضی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تعلیم الاسلام کالج کا ماہنامہ اس مقصد کو پیش نظر رکھے۔ اور معیاری ہونے کے علاوہ جدید علوم اور اسلامی نظریات کا آئینہ دار ہو۔

ایک رسالہ میں فاضل مدیر نے المنار کے مسلک پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھا :۔

المنار کا مسلک یہی ہے کہ طلبہ کے خیالات کو گمراہ کن غیر افادی پگڈنڈیوں پر بھٹکتے پھرنے کی بجائے موزوں اور منفعت بخش ڈگر پہ گامزن کیا جائے۔ ان میں عملی تجسس، دینی تحقیق و تدقیق کا مادہ پیدا کر کے سنجیدہ نگاری پہ مائل کیا جائے اور دور حاضر کی خطرناک مادیت کے ہوش ربا شعلوں کی بربادیوں سے باخبر رکھتے ہوئے انھیں اسلامی نظریات اور اقدار کا علمبردار بنایا جائے۔[1]

المنار کا اشتراکی شمارہ شروع سے ہی انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شائع ہو رہا ہے۔ بعض دفعہ کسی وجہ سے انگریزی کا حصہ شائع نہ کیا جا سکا اور کچھ مرتبہ حصہ انگریزی علیحدہ بھی چھپتا رہا۔ ایک دفعہ اس رسالہ کے کچھ صفحات پنجابی کے لئے بھی مخصوص کئے گئے۔ چنانچہ سب سے پہلا مضمون اس زبان میں چھنّاں دیاں چھلّاں کے کالم میں "ٹالسٹائے دا نظریہ فن" کے موضوع پہ نویں جلد کے شمارہ ۱+۲ میں سمیع اللہ قریشی ایم اے کے قلم سے شائع ہوا۔ ایک دو پنجابی نظمیں بھی چھپیں مگر افسوس یہ سلسلہ یہیں ختم ہو کر رہ گیا۔

جلد ۱۲ کے پانچویں شمارہ میں پہلی مرتبہ عربی کے لئے چند صفحے وقف کئے گئے اور رشید احمد جاوید اور عطاء المجیب راشد کے مضامین علی الترتیب لا اکراہ فی الدین اور ان رحمۃ اللہ واسعۃ کے عناوین پر شائع ہوئے۔ اسی طرح بعض مطبوعہ عربی نظموں کو بھی جگہ دی گئی۔ اسکے بعد سے یہ حصہ بے قاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

عربی مضامین میں سے اہم یہ ہیں :۔ جیدہ حسن ۔ زہیر بن ابی سلمی ۔ لبیقہ فرحت :۔ حسان بن ثابتؓ ۔

عطاء المجیب راشد ۔ مسئلۃ التقدیر ، فضائل العلم و وسائل حصولہ

ہمارے معزز اساتذہ کرام میں سے جن جن کے سپرد کسی وقت المنار کے اُردو یا انگریزی کسی حصہ کی نگرانی رہی ہے اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :۔

(اس جگہ نیز طالب علم مدیران کی فہرست میں المنار کا نمبر ہی دیا گیا ہے (اُوپر رسالہ کا نمبر نیچے جلد کا نمبر) لیکن بعض رسالوں پر نمبر غلط تھے۔ اس لئے بہتر یہی سمجھا گیا کہ ان مہینوں کے نام لکھ دیئے جائیں جن کے لئے وہ شمارہ شائع کیا گیا تھا)۔

---

[1] دیکھئے المنار ۱+۲/۸ نمبر (ادارہ)

بشارت الرحمٰن ایم اے : ۴/۴ ، ۱/۵ ، جون ۵۶ء ، نومبر ۵۶ء ، (۱۱+۱۲)/۶ ، (۱+۲)/۷ (حصہ اُردو)

حمید احمد چوہدری " : اکتوبر، نومبر، دسمبر ۶۳ء تا ......

خورشید احمد مرزا " : (۱+۲، ۳+۴)/۹ جلد ۱۰ مکمل، جلد ۱۱ مکمل، جلد ۱۲ مکمل، (۱، ۲، ۳)/۱۳ (حصہ انگریزی)

سعید احمد رحمانی[1] " : (۳+۴، ۵+۶، ۷+۸)/۸ (")

اخوند عبد القادر مرحوم[2] " : ۲/۲ ، جلد ۳ مکمل، جلد ۴ مکمل (")

فیض الرحمان فیضی " : جلد ۱ مکمل (۱، ۲، ۳)/۲ (حصہ اُردو)

شیخ محبوب عالم خالد " : ۴/۲ ، جلد ۳ مکمل، (۱، ۲، ۳)/۴ ، (۳+۴، ۵+۶، ۷+۸)/۷ ، جلد ۸ مکمل، جلد ۹ مکمل، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۶۳ء تا ...

محمد شریف خالد " : جلد ۱۰ مکمل، جلد ۱۱ مکمل، جلد ۱۲ مکمل، (۱، ۲، ۳)/۱۳ (حصہ اردو)

چوہدری محمد علی " : جلد ۱ مکمل، (۱، ۲، ۳)/۲ ، فروری، مارچ ۵۶ء ، جون، جولائی ۵۶ء (حصہ انگریزی)

مختلف اوقات میں ہمارے کالج کے جن طلباء کو المنار کی ادارت کی سعادت حاصل ہوئی، اُن کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

یاد رہے کہ یہاں اعلیٰ سے مراد مدیر اعلیٰ ہے۔ بعض رسائل حصہ اُردو پر مرتبین کے نام کے ساتھ مدیر اعلیٰ یا مدیر کا لفظ نہیں لکھا گیا۔ ایسی صورت میں سب سے اُوپر والے نام کو مدیر اعلیٰ تصور کیا گیا ہے اور باقیوں کو اس کا نائب۔ بعض شماروں میں مدیر اعلیٰ کی بجائے مدیر، اور اس کے نائبین کو نائب مدیران کہا گیا ہے۔ ایسی جگہوں پر مدیر کو ہی مدیر اعلیٰ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

نائب سے مراد نائب مدیر ہے۔ ہاں اگر کسی رسالہ میں مدیر کے اوپر مدیر اعلیٰ کا نام ہے تو اس مدیر کو اِس فہرست میں نائب مدیر کہا گیا ہے۔

ارشد ترمذی : نائب = ۵/۱۱ ، اعلیٰ = جلد ۱۲ مکمل۔

آغا خالد سلیم : نائب = ۱/۵ ، جون ۵۶ء ؛ اعلیٰ = نومبر ۵۶ء ، (۱۱+۱۲)/۶ ، (۱+۲)/۷ ،

اللہ یار، مہر : نائب = (۱+۲، ۳+۴، ۵+۶)/۸

ایاز محمود خاں : نائب = جون ۵۶ء ، نومبر ۵۶ء ، (۱۱+۱۲)/۶ ، (۱+۲)/۷ ،

---

[1] اسی کالج کے اولڈ بوائے ہیں۔ C.S.P کا امتحان پاس کرنے کے بعد آجکل ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

[2] کالج کے پرنسپل کے بعد سب سے سینئر پروفیسر رہے ہیں۔ آپ کالج یونین کے پریذیڈنٹ اور ناظم امتحانات بھی رہے۔ بحیثیت استاد انگریزی ایک جادو بیان لیکچرار تھے جو طلباء کو مسحور کر لیتے تھے۔ طلباء سے از حد بے تکلف، خوش مزاج اور بہت شفیق استاد تھے۔

بشیر احمد رفیق : اعلیٰ ، ۱، ۲، ۳/۴ ۔

رشید احمد جاوید : نائب ؛ ۲+۳، ۳+۴، ۵/۱۲ ؛ اعلیٰ = ۱، ۲، ۳/۱۲ ۔

رشید قیصرانی، سردار : اعلیٰ = جلد ا مکمل ۔

سعد اللہ دُرّانی : نائب = ۱، ۲/۴ ۔

سمیع اللہ قریشی : نائب = جلد ۴ مکمل ۔

سلیم اختر صدیقی : نائب = ۳+۴، ۵+۶، ۷+۸/۸

شمشاد علی، سید : نائب = ۴/۱۲ ، جنوری، فروری، مارچ ۶۴ء ، ۱، ۲/۱۲ ۔

عبد الواسع عمر : اعلیٰ = ۱، ۲/۲

عبد اللطیف : نائب = جلد تین مکمل ۔

عطاء المجیب راشد : نائب = ۳/۱۲ ؛ اعلیٰ = ۴/۱۲ ، جنوری، فروری، مارچ ۶۴ء ، ۱/۱۲ ، ۲/۱۲ ، ......

فیض اسلم : نائب = ۱، ۲/۱

کلیم اللہ خان : نائب = ۱+۲، ۳+۴/۹ ؛ اعلیٰ ۱+۲، ۳+۴/۱۰ ، ۵/۱۱

لطف الرحمٰن محمود : نائب = ۳+۴، ۵+۶/۷ ؛ اعلیٰ ۷+۸/۷ ، جلد ۸ مکمل، ۱+۲، ۳+۴/۹

لطیف احمد قریشی : نائب = ۳+۴، ۵+۶/۷ ، ۷+۸/۸ ۔

مبارک احمد عابد ربّانی : نائب = ۲/۱۲ ، ۳/۱۲ ، جنوری، فروری، مارچ ۶۴ء ، ۱/۱۲ ، ۲/۱۲ ۔ ......

محمد اسلام بھٹی : اعلیٰ = ۱/۵ ، جون ۵۶ء ۔

محمد اسلم، باجوہ : نائب = ۱، ۲/۲ ، اعلیٰ ۳، ۴/۲ ۔

محمد الیاس، مرزا : نائب = ۳+۴/۹ ، ۱+۲، ۳+۴/۱۰ ، ۵/۱۱ ۔

مطیع اللہ درد : اعلیٰ = جلد ۴ مکمل ۔

ناصر احمد پرویز : نائب = ۴/۴ ، ۱/۵ ، جون ۵۶ء ، نومبر ۵۶ء ، ۱۱+۱۲/۹ ، ۱+۲/۷ ، اعلیٰ ۳+۴، ۵+۶/۷

نور الدین امجد : نائب = ۳، ۴/۲

حصۂ انگریزی

اس لسٹ میں اعلیٰ سے مراد چیف ایڈیٹر ہے خواہ اس کا نائب کوئی نہ بھی ہو ۔

اسسٹنٹ ایڈیٹر ، ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ، اور اگر چیف ایڈیٹر کے نیچے صرف ایڈیٹر کا لفظ کسی نام کے ساتھ درج ہو تو ان سب کا ترجمہ نائب کے لفظ سے کیا گیا ہے ۔

اگر ایک سے زیادہ نام مرتّبین کی فہرست میں درج ہوں اور چیف ایڈیٹر اور ایڈیٹرز کا امتیاز نہ رکھا گیا ہو۔ تو اس فہرست میں سب سے اوپر والے نام کو اعلیٰ کہا گیا ہے۔

اعجاز الحق قریشی : نائب = ستمبر، اکتوبر ۶۱ء ؛ اعلیٰ، $\frac{۳+۴، ۵}{۱۲}$ ، جلد ۱۳ مکمل۔

اعجاز الرحمٰن : نائب = جلد ۴ مکمل۔

افتخار احمد شہاب : نائب = فروری، مارچ ۵۶ء ؛ اعلیٰ جون، جولائی ۵۶ء۔

الیاس بشیر، سید : اعلیٰ = $\frac{۱+۲}{۱۰}$ ، $\frac{۵}{۱۱}$ ۔

اے۔ اے۔ اسماعیل: نائب = $\frac{۷+۸}{۸}$ ۔

پرویز۔ سی۔ حسن : نائب = $\frac{۴}{۱۳}$ ، جنوری، فروری، مارچ ۶۴ء۔

جعفر سولمی : نائب = $\frac{۱+۲}{۱۰}$

حسن مسٹن : نائب = جلد ۱۳ مکمل۔

حمید احمد : نائب = جلد ۳ مکمل، فروری، مارچ ۵۶ء، جون، جولائی ۵۶ء۔

خلیل الرحمٰن : نائب = $\frac{۴}{۱۳}$ ؛ اعلیٰ = جنوری، فروری، مارچ ۶۴ء۔

رشید احمد : اعلیٰ = جلد ۸ و ۹ مکمل۔

رفعت اللہ خاں : اعلیٰ = $\frac{۲}{۱۴}$ .....

سعید عبداللہ : نائب = فروری، مارچ ۵۶ء، جون، جولائی ۵۶ء۔

سلیم اختر صدیقی : نائب = $\frac{۵+۶، ۷+۸}{۸}$ ۔

ظفر اسماعیل : اعلیٰ = $\frac{۱}{۱}$ ۔

عبداللہ ابوبکر : نائب = $\frac{۵+۶}{۸}$ ۔

عطاء المجیب راشد : اعلیٰ = $\frac{۱}{۱۴}$ ۔

فضل احمد : اعلیٰ = ستمبر، اکتوبر ۶۱ء ؛ نائب = $\frac{۳+۴}{۱۲}$ ۔

کنور ادریس : اعلیٰ = جلد ۴ مکمل۔

مبارک احمد مدراسی : نائب = $\frac{۲}{۱}$ ۔

محمد اسلام بھٹی : اعلیٰ = فروری، مارچ ۵۶ء۔

محمود احمد : اعلیٰ = $\frac{۴}{۱۲}$ ، نائب = جنوری، فروری، مارچ ۶۴ء۔

معفور احمد، مرزا : نائب = $\frac{۱}{۱۴}$

منیر احمد، شیخ : نائب = $\frac{۱}{۱}$ ؛ اعلیٰ = $\frac{۲، ۴}{۱}$ ۔

منیرالدین احمد : نائب : جون، جولائی ۵۶ء

مودود احمد خاں : نائب : $\frac{۲+۱}{۱۰}$ ، $\frac{۵}{۱۱}$ -

ناصر احمد سید : نائب : $\frac{۴}{۱}$ ، جلد ۲ مکمل

نصیر احمد طاہر : نائب : $\frac{۳+۴، ۵}{۱۲}$

نعیم احمد : اعلیٰ : جلد ۲ مکمل

نعیم الزمان : نائب : $\frac{۲}{۱۴}$ تا . . . . .

نورالدین احمد : اعلیٰ : جلد ۳ مکمل

نورالدین احمد : نائب : $\frac{۱}{۱}$ -

ہمارے اکثر طلباء کو یہ شکایت رہتی ہے کہ المنار میں چھپنے والا مواد دلچسپ اور معیاری نہیں ہوتا اور یہ کہ دیگر کالجز کے جرائد اِس سے کہیں بہتر ہوتے ہیں ۔ جہاں تک عشق و محبت کے افسانوں کا تعلق ہے۔ ان کا تو اس رسالہ میں جگہ پانا ہی ناممکن ہے اسلئے کہ یہ اس کے مسلک کے خلاف ہے اور پھر جب ملک کے دیگر فلمی، ادبی اور علمی رسالوں کے صفحات ہمارے نوجوان طبقہ کے اس نشہ کو پورا کرنے کے لئے بہت کافی ہیں. تو اس رسالہ میں، جس کا نصب العین بہت بلند ہے، ایسی باتوں کے دخل کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

رہا علمی و ادبی اور ٹھوس قسم کے مضامین کی کمی اور ان کے غیر معیاری ہونے کا سوال تو اس سلسلہ میں ہمیں کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ المنار کالج کے طلباء کا رسالہ ہے جن میں سے اکثر نووارد اور ناتجربہ کار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر جذباتیت سے کام لیا جائے تو معیار قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اگر ان نووارد اصحاب کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو دلوں کے نازک آبگینوں کی شکست کا خطرہ منڈلاتا نظر آتا ہے۔ نئے کرمفرماؤں کے استقبال کی خاطر ادارے کو جھکنا پڑتا ہے اور یہی لچک اور نرمی اس کمزوری کا سبب ہے۔

اس بات کی ایک اور وجہ جس کا اظہار بارہا المنار کے اداریوں میں کیا جا چکا ہے۔ طلباء کا عدم تعاون ہے۔ نیز کالج کا جریدہ بہرحال کالج کا جریدہ ہے اور اس سے زیادہ اس سے توقع رکھنا ایک خاصی غیر معقول سی بات ہے۔

المنار کی جلد ۳ شمارہ ۱ میں معیارِ تنقید عنوان دیکر معترضین کے اسی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا گیا:۔

"المنار میں بعض اوقات بعض ایسے ادبی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں جن کا معیارِ تنقید پختہ کار اصحاب کے نقطہ نظر کے مطابق نہیں ہوتا۔ ہم انہیں المنار میں جگہ دیتے ہیں تو اسلئے نہیں کہ اُن امور کے جن کے متعلق ان مضامین میں خامہ فرسائی کی جاتی ہے کلیتہً صحیح سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ مضمون نگار کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اس امر کی دلیل کہ مضمون نگار میں غور و فکر کی صلاحیت موجود ہے جسے وہ بروئے کار لانے کے درپے ہے۔ مستند اساتذہ کی رائے ان کے متعلق خواہ مبیّنہ رائے سے مختلف ہو مگر طلباء کا اس کے متعلق ذاتی نظریئے پر قائم رہنا یقیناً قابلِ داد ہے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا باعث۔ اس لئے ہم ایسے ادبی مضامین شائع کر دیتے ہیں تاکہ دیگر طلباء میں بھی ذاتی

غور و فکر کی عادت پیدا ہو کیونکہ آئندہ زندگی میں انکی کامیابی اور شادکامی کا مدار بہت کچھ اسی پر ہے۔

اسی امر کو زیر بحث لاتے ہوئے ایک مرتبہ فاضل مدیر نے لکھا:۔

"اس جریدہ کا مقصدِ اوّلین یہی ہے کہ طلبہ کی فطری استعدادوں کو بیدار کر کے ان میں قوتِ تحریر پیدا کی جائے اور ذہنی جلاء کا سامان مہیا کیا جائے۔ حتی الوسع نیک نیتی اور نہایت فراخدلی سے نوخیز ادیبوں کی طرف سے موصول ہونے والے فن پاروں کو شریکِ اشاعت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ طلباء کے عام علمی اور ذہنی پس منظر کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ناقدانہ تعزیروں کے کڑے پہروں سے ان کی تخلیقات کا گلا گھونٹا نہیں گیا۔ اس نرمی اور لچک کی وجہ سے کمزوری یقیناً رہ گئی ہوگی۔ ہمارے ناقدین بھی اگر اس امر کو ملحوظ رکھیں کہ یہ طلبہ اور صرف طلبہ کا رسالہ ہے تو ہمیں یقین ہے۔ انکی عالی ظرفی کا طلسمِ ناپختگی اور احساس سطحیت کی ٹھوکر سے پاش پاش ہونے سے بچ جائے گا۔ ہمارے نزدیک خدمتِ ادب کے سلسلہ میں باذوق طالب علم کی ابتدائی مخلصانہ کاوش کی عظمت کا تحفظ ناقدانہ تعزیروں کے پٹے ہوئے مہروں کے تقدّس سے زیادہ عزیز ہے۔ ممکن ہے ان نو واردانِ دشتِ ادب میں سے ہی کوئی سرِ منزل کامرانی کا چراغ روشن کر سکے۔" (۱/۸ — ۲۰ ۔ اداریہ)

ذیل میں اداریوں، متعدد مستقل کالمز، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین، افسانوں، ڈراموں اور مختصر نوٹوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً جو مضامین المنار (حصّہ اردو) کے صفحات کو رونق بخشتے رہے ہیں۔ ان میں سے نسبتاً اہم مضامین کی فہرست پیشِ خدمت ہے۔ سب کے سب مضامین معیاری کہلانے کے مستحق تو نہیں تاہم انکے عنوانوں کی اصلیّت کے پیشِ نظر ان کا اندراج اس جگہ کیا جا رہا ہے۔ شاید کسی وقت کسی کے لئے مفید ثابت ہوں۔

خطبات جلسہ ہائے تقسیم اسناد: (حضرت مرزا) بشیر الدین محمود احمد (خلیفۃ المسیح الثانی) صلاح الدین احمد، مولانا (۶۳ء): ۴/۱۲ + ظفر اللہ خاں، چودھری (۵۴ء): ۲/۴ + مختار احمد، حافظ، شاہجہانپوری (۶۴ء): ۱/۱۲ + م۔ د۔ کیانی (۶۰ء): ۵+۶/۱ — **روئیداد ہائے کالج۔** ناصر احمد، مرزا، پرنسپل: ۴۸-۴۹ء و ۴۹-۵۰ء ۲/۱، ۵۰-۵۱ء ۱/۲، ۵۳-۵۴ء ۳/۴، ۵۹-۶۰ء ۵+۶/۹، ۶۳-۶۴ء ۱/۱۴ — **اسلام اور اسلامیات:** ابو العطاء: قیامت پر ایمان ۵/۱۲ — بشارت الرحمن ایم اے: اسلامی شعائر کی اہمیت ۲/۴ — ۲/۱ — ۱/۲، ظاہر اور باطن ۵+۶/۷ — ۷+۸/۷، توحیدِ کامل ۵/۱۱، تقدیر الٰہی ۱+۲/۱۰، اسلام دین فطرت ہے ۳/۱۲، تقدیر و تدبیر جون ۵۶ء، طالب علم اسلامی نقطہ نظر سے ۲/۱۲ + رفیق احمد ثاقب: اسلام کا نظریۂ مساوات ۳/۴ + صلاح الدین احمد خلیفہ: ثقافتِ اسلامیہ ۳+۴+۵+۶/۸، ۷+۸/۸ + غلام احمد، مولانا، بدوملہوی: مسلمان عورت کا اندازِ گفتگو و لباس ۱/۲ + غلام باری سیف: علم حدیث ۱+۲/۱۰ + محمد اسلم چوہان: شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ ۲/۱ + منیر البی: اسلام کا نظریہ اجتماع ۷+۸/۸ — **سیرت النبی:** بشارت الرحمن ایم اے:

حضرت رسول اکرم صلعم کی ذاتِ بابرکات پر فرائڈ اور اسکے ہمنواؤں کے اعتراضات کے جوابات ۴/۲ + داؤد طاہر : رحمۃ للعالمین ؐ کا اپنے دشمنوں سے حسنِ سلوک ۳/۱۳ + عطاء المجیب راشد : آنحضرتؐ کا اپنے دشمنوں سے حسنِ سلوک ۵/۱۲ + **اسلاف کے کارنامے** : حبیب اللہ خاں : علوم کی ترویج میں مسلمانوں کا حصہ ۳/۱ + حمید اللہ خاں : مسلمان اور علمِ جغرافیہ ۱/۵ + عبدالشکور اسلم : مسلمانوں کا علومِ فلکیات میں حصہ ۵/۱۱ + **تصوّف** : حمامۃ البشریٰ : اسلام اور تصوّف ۲/۱۳ + ضیاء الحق قریشی : تصوّف کیا ہے ۵+۶/۸ + **تاریخ** : اعجاز الحق قریشی : اموی عہد میں علم و ادب ۱+۲/۱۰ + بشارت الرحمٰن ایم اے : تاریخ اسلام کے متعلق بعض اصولی نظریئے ۲/۳ + جنید ہاشمی : مکتوبات نبوی ؐ پر ایک نظر ۲/۱۳ + حمید احمد : دُنیا کا سب سے پہلا کتب خانہ ۳+۴/۸ + عزیز احمد طاہر : نہر سویز ، نومبر ۵۶ء سنہ + عطاء الکریم : دورِ جاہلیت میں عربوں کے علوم و فنون ، جون ۵۶ء سنہ + عطاء المجیب راشد : غزوۂ بدر ۲/۱۳ + غلام احمد ، مولانا ، بدوملہوی : قدیم عربوں کے اخلاق و اعمالِ فاضلہ ۲/۲ + محمد سلیم : آنحضرت صلعم کی آمد سے عرب میں عظیم الشان انقلاب ۱+۲/۱۰ + واجد حسیب : آزادیٔ وطن کے لئے مسلمانوں کی جد و جہد ۳/۱۳ + **سائنس** : حبیب اللہ خاں : خلا کی تحقیق اور اسکے ذرائع ۱/۱۳ + لطف الرحمٰن محمود : چاند کی سیر ۱+۲/۸ + عبدالسبحان : ٹیلی ویژن ۲/۱۲ + محمد ارشد : سورج سے بجلی ۲/۱۳ + محمد رفیق ، مرزا : جوہری توانائی ۲+۳/۱۲ ۔ **نفسیات** : حمید احمد بھٹی : بچے کی نفسیات ۳+۴/۷ شرمیلا پن ۔ نفسیاتی تجزیہ ۷+۸/۷ + فیض احمد اسلم : بچے کی نفسیات ۱/۲ + لطیف قریشی : دوستی کے آغاز کا نفسیاتی پہلو ۳+۴/۷ ، عقیدت کا نفسیاتی تجزیہ ۵+۶/۷ + محمد علی : احساس کہتری ۱/۱۳ + منو حسین : والدین کی محبت کا نفسیاتی پہلو ۲/۱ ۔ **اقتصادیات** : بشارت الرحمٰن : پاکستان میں سیم و تھور کے مسائل ۵/۱۲ + سلیم اختر صدیقی : اقتصادی ترقی ۴/۱۳ + **لسانیات** : جنید ہاشمی : زبان کی ابتداء ۲/۱ ۔ **ادب** : اعجاز الحق قریشی : ادب کی اہمیت ۲+۳/۱۲ + جنید ہاشمی : ارتقائے ادب اور جدید رجحانات ۱/۱ + جیلانی کامران : ادب اور بنیادی انسانی اقدار ۲، ۳/۱۳ + لطیف احمد قریشی : ادب ۔ پیدائش اور مقاصد ۳+۴/۹ ۔ **شاعری** : جنید ہاشمی : شاعری میں مناظر قدرت کا استعمال ۳/۱ + شعر کیا ہے ؟ ۲/۱۲ + سلیم اختر صدیقی : شاعری ۱+۲/۸ ۔ **عربی ادب و شاعری** : اعجاز الحق قریشی : حسان کی شاعری ۵/۱۲ + عطاء المجیب راشد : سات قصیدے جو خانہ کعبہ کے پردوں پر لٹکائے گئے ۱/۱۴ + زیڈ ، ایچ قریشی : عربی شاعری کی ایک جھلک ۱+۲/۹ + محمد نصر اللہ احسان الٰہی ، رانا : بدیعات ۲/۲ + **اردو ادب اور شاعری** : ابواللیث صدیقی ، ڈاکٹر : اُردو کی ابتداء کا مسئلہ ۴/۲ + اللہ یار ، مہر : غالب کی شاعری ۱+۲/۸ + مرزا فرحت اللہ بیگ کا اسلوبِ بیان ۵+۶/۸ + بشیر احمد رفیق : اُردو شاعری پر ایک نظر ۴/۱ ، ۱/۲ + جنید ہاشمی : حالی ایک نقاد کی حیثیت سے ۲/۴ + ریاض احمد : کچھ جدید غزل کے بارہ میں ۱+۲/۹ + طارق سعید مرزا : اقبال کا فقر ۱+۲/۹ + صلاح الدین احمد ، مولانا : ہماری زبان اور ادب کے چند مسائل ۱۱+۱۲/۹ + عبادت بریلوی ، ڈاکٹر :

اُردو تنقید پر ایک نظر ۲ ۱/۳ + قاصد ظریف: غالب کے نام ایک خط ۳/۴ + لطف الرحمٰن محمود: میر درد کی صوفیانہ شاعری کا ایک محبوب موضوع ــــ بے ثباتی ۱+۲/۸ + اردو شاعری کا زریں دور ۱/۱۴ + مبشرات احمد، سید: مولانا حالی کی تنقید نگاری ۳/۲ + محمد الیاس سلیمی: اقبال کا اُردو شاعری میں مرتبہ ۳+۴/۸ + محمد الیاس، مرزا: اقبال کی شاعری میں مناظر قدرت کا استعمال ۳+۴/۹ + مقبول حسین، سید: عدم کی شاعری ۱+۲/۹ + وزیر آغا، ڈاکٹر: اردو شاعری میں طنز و مزاح ۱+۲/۲ + ہدایت اللہ ہادی: خواجہ حیدر علی آتش ۴/۱۳ - **فارسی شاعری**:- حمید اللہ ظفر: امیر خسرو دہلوی ۵/۱۲ + فیض احمد اسلم: اردو اور فارسی شاعری میں بدیہہ گوئی ۱/۱ محمد الدین، مولوی: عمر خیام کی چند رباعیات ۵/۱۱ + منیر احمد فرخ: رباعیاتِ سرمد کی چند خصوصیات ۵/۱۲ - **انگریزی ادب**: عبد اللطیف: شیکسپیئر جولیس سیزر میں ۳/۲ + شیلے اور اس کی شاعری ۱/۳ + کروچے کا نظریہ فن ۳/۴ + **تراجم**: (انگریزی سے) ظفر اسماعیل: ہماری کائنات ۳/۲ + فیض الرحمٰن فیضی: دھوکے (لارڈ لٹن کے مشہور انگریزی ناول Last days of pompeii کے ایک باب کا ترجمہ) ۱/۲ + محمد احمد مظہر، ایڈووکیٹ: کیا اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ۵+۶/۷ - منظور شاکر: دنیا کے طویل الفاظ ۱۱+۲/۹ - **تعارف**: بشیر احمد رفیق: پشتو شاعری خوشحال خاں ۳/۱ - منظور شاکر: پنجابی زبان کا قادر الکلام شاعر (میاں محمد بخش) ۵+۶/۸ - **تعلیم**: رفیق احمد ثاقب: ہمارا تعلیمی نظام ۱/۴ + فیاض احمد، اخوند: یونیورسٹی (اُسوقت کے حالات کے مطابق تعلیم کی ترویج و ترقی کے لئے بعض تجاویز ۴/۱ + ۱/۲ - **رسم الخط**: جنید ہاشمی: زمانہ آنحضرت صلعم کا رسم الخط ۴/۱ + سجاد امام: ایرانی رسم الخط ۱/۱۳ - **متفرقات**: امجد محمود نوشہروی: "خون جگر ہونے تک" پر ایک نظر ۴/۱۳ + بشارت الرحمٰن ایم اے: **الحکمۃ ضالۃ المومن** (قطار بندی اور اس کی اہمیت) ۳+۴/۱۲ + جنید ہاشمی: غالب کا استغراق (ایگزیما) ۳+۴/۱۰ محمد احمد: منگلا ڈیم، ایک عظیم منصوبہ ۱/۱۴ -

●

حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ، حضرت امام جماعت احمدیہ۔ شعراءِ سلسلہ، مقامی شعراء، بیرونی کالجز کے شعراء اور بعض مشہور و معروف ملکی شعراء کے کلام کے علاوہ جو "المنار" کے بہت سے صفحات کی تزئین کا باعث بنتا رہتا ہے۔ ہمارے ان قابلِ صد احترام اساتذہ کرام اور ہم مکتب بھائیوں کی بھی بعض نظمیں (آزاد اور مقفّٰی دونوں) غزلیں، رباعیات اور قطعات وغیرہ وقتاً فوقتاً ہمارے کالج میگزین کی شان دوبالا کرتے رہے ہیں، کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

ابن احمد جنگوی۔ ارشد ترمذی۔ اظہر سلیم سلیمی، شیخ۔ آغا شاہین۔ افضال زکی۔ اقبال احمد خاں۔ الیاس احمد شاہین۔ الیاس بشیر احمد، سید۔ ایل ایم احمد۔ بشارت جمیل۔ بشیر احمد شاہ۔ پرویز پروازی۔ جاوید منگلوی۔ جمیل شاہین، شیخ۔

جنید ہاشمی۔ خالد ہدایت بھٹی۔ خلیل احمد خلیل۔ خلیل رامپوری۔ خلیق اختر چودھری۔ خلیق منصوری۔ خورشید جالندھری راحت ملک۔ راشد چودھری۔ رانا محمد خاں۔ رشید احمد طیب۔ رشید قیصرانی، سردار۔ رضا گیلانی۔ سجاد ظہیر سید۔ سعد درانی۔ سعید بٹ۔ سعید کاشر۔ سلیم اختر صدیقی۔ سمیع اللہ قریشی۔ سعادت علی سید۔ طارق سعید طاہر۔ عابد ربانی۔ عبدالباسط ملک۔ عبدالباسط وحید۔ عبدالحلیم صادق۔ عبدالحمید عابد۔ عبدالرشید تبسم۔ عبدالسلام اختر عبدالعزیز، صوفی۔ غلام علی، چودھری۔ فیض اسلم۔ فیض الرحمٰن فیضی۔ قاصد ظریف۔ قمرالزمان قمر۔ قمر کاشمیری۔ کاشر کاشمیری۔ کلیم اللہ خاں۔ کریم قمر۔ لطف الرحمٰن محمود۔ لطف المنان ساحر۔ مبشر احمد طاہر۔ مجیب الرحمٰن فائق۔ مجیب اللہ خان کشور۔ محمد احمر۔ محمد اقبال اختر۔ محمد اکرام خاں محمد خیر البشر، سید۔ محمد رشید اکبر۔ محمد زکریا طاہر۔ محمد سعید اصغر۔ محمد شریف خالد۔ محمد علی، چودھری۔ محمد مقبول الٰہی۔ محمد ہادی مونس (مومن)۔ محمود احمد ایاز۔ مشتاق احمد شائق۔ مظہر سمیع اللہ۔ مظہر قیوم ظفر۔ معتصم حمایت اللہ خاں، صاحبزادہ۔ مفیق اختر۔ منصور احمد ظفر۔ منظور شاکر۔ منور احمد جاوید۔ نصیر احمد خان۔ نصیر طاہر۔ نعیم قدسی۔ ناصر احمد باجوہ اور ہدایت اللہ ہادی۔

●

المنار کے متعلق بعض آراء

المنار کے شمارہ ۱/۲ میں جناب عباس بن عبدالقادر ایم اے نے جائزہ کے عنوان سے ایک مضمون (جو المنار کی پہلی جلد پر تبصرہ پر مشتمل تھا) لکھا:۔

> المنار فی الحقیقت اپنی افادیت کے اعتبار سے اُردو ادب کے بحرِ ذخار میں ستونِ روشنی ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ . . . . المنار جس نوعیت سے شروع کیا گیا ہے اور جس انداز سے شائع ہو رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس رسالہ میں . . . وہ سب باتیں موجود ہیں جو ایک رسالہ کی ترقی کی ضامن ہوا کرتی ہیں۔

محترم نصیر احمد خاں صاحب ایم ایس سی (جو آجکل ڈاکٹریٹ کے لئے بیرونِ ملک میں مقیم ہیں) نے ایک مرتبہ المنار کی ترقی کے لئے مختلف تجاویز پیش کرتے ہوئے ایڈیٹر کے نام اپنے مکتوب میں لکھا:۔[1]

> اس بات سے بڑی مسرت اور تسکین ہوتی ہے کہ المنار کا معیار دیگر کالجوں کے رسالوں کی نسبت بلند اور انداز سنجیدہ ہے اور اس میں شائع ہونے والے مضامین اپنی افادیت کے لحاظ سے ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ تاہم ابھی تک اصلاح اور ترقی کے میدان کی ابتدائی منازل ہی طے ہوئی ہیں۔ امید

---

[1] دیکھئے شمارہ ۲/۲۔

واثق ہے کہ اگر المنار ترقی کی راہ پر اسی طرح گامزن رہا تو عنقریب ایک معیاری رسالے کی حیثیت حاصل کرلے گا۔

المنار کے پہلے سالنامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیل آزری (جنرل سیکرٹری بارگاہِ ادب، لاہور) نے لکھا[۱]:۔

"سالنامہ المنار کو دیکھکر "علیگڈھ میگزین" یاد آگیا۔ یوں تو پاک پنجاب کے ہر کالج سے ایک میگزین نکلتا ہے لیکن میں وثوق اور اطمینانِ کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ المنار اپنی نوعیت کے لحاظ سے تمام میگزینوں کا سرتاج ہے۔ کیونکہ اس میں 'ادب برائے ادب' بھی ہے اور 'ادب برائے زندگی' بھی۔ منجملہ دوسری خوبیوں کے ایک خصوصی اور نمایاں خوبی اس میں یہ ہے کہ اس کے لکھنے والے کالج کے اساتذہ اور طلباء ہیں۔ مضامین سب کے سب ماشاء اللہ نہایت درجہ مفید اور سہل الفہم انداز میں لکھے گئے ہیں۔ .... اگر اسکی ترقی کی یہی رفتار رہی تو بہت جلد المنار انسانیت کا واحد راہنما اور اخلاقیات کا صحیح ترجمان ثابت ہوگا۔"

اسی شمارہ پر ہمارے کالج کے ایک سابق طالب علم نورالدین امجد (جو المنار کے دونوں حصوں کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں) کی رائے ملاحظہ ہو[۲]:۔

ایک ہی سال میں المنار نے جو ترقی کی ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ اور اگر یہی رفتار رہی تو امید ہے کہ بہت جلد المنار اپنے لئے ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کرلیگا۔ انشاء اللہ۔ مضامین اچھے خاصے ہیں اور ان میں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ادبی شعور ترقی کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی (سینئر لیکچرار شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی) نے ادارہ المنار کے نام اپنے ایک گرامی نامہ میں ایک شمارہ پر ان الفاظ میں اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمایا[۳]:۔

بعض مضامین نہایت مفید اور دلچسپ ہیں۔ .... بحیثیت مجموعی رسالہ ایک کالج کے طالبعلموں کا اچھا رسالہ ہے۔

ہمارے مجلّہ کے متعلق کالج کے بعض طلبہ کے خیالات ملاحظہ ہوں[۴]:۔

کئی کالجوں کے میگزین پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر صحتِ فکر اور پاکیزگیٔ خیال کا جو لحاظ المنار کے کالموں میں رکھا جاتا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ملا۔ المنار کے ادارتی نوٹ جس قومی سپرٹ اور ملّی روح سے لکھے جاتے ہیں، وہ روشنی اور رفعت کے نشان کے تقاضوں کو بالکل پورا کرتے ہیں۔ المنار کے افسانے بھی تعمیری ہوتے ہیں۔ رنگِ تغزّل بھی بیسوی صدی کی پراگندہ خیالی سے پاک ہے۔ ادارہ المنار کی نظرِ انتخاب بجا طور پر قابلِ فخر ہے۔ (ناصر احمد چودھری)

---

[۱] دیکھئے شمارہ ۲/۲ ۔ [۲] دیکھئے شمارہ ۲/۲ ۔ [۳] دیکھئے شمارہ ۳/۲ ۔ [۴] شمارہ ۲/۱۳ ۔

المنار ان چند بہترین رسالوں میں سے ہے جنہیں مَیں عزّت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ (امان اللہ اعوان)[1]

المنار کے متعلق تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں کے ایک طالب علم کے تأثرات ان الفاظ میں پوشیدہ ہیں:۔

کئی کالجوں کے میگزین نظر سے گذرتے رہتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی آپ کا المنار ان سب میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ یہ کیسی خوشی کی بات ہے کہ کم از کم ایک کالج کا رسالہ ایسا بھی ہے جس کے عام دنیوی مضامین بھی اسلامی قدروں کو ذہن نشین کر کے لکھے جاتے ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ المنار کی اس انفرادیت کو قائم رکھے۔

جامعہ احمدیہ، ربوہ کے ایک طالب علم کے خیال میں:۔

المنار کے مضامین اندازِ فکر اور جاذبیت کے لحاظ سے یقیناً ایک اعلیٰ معیار پر ہیں۔[2]

ڈاکٹر عبادت بریلوی المنار کا ایک پرچہ دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

المنار ملا۔ اچھا پرچہ ہے۔ سلیقے سے مرتّب کیا گیا ہے۔ مضامین اچھے ہیں۔ دیکھنے میں بھی خوبصورت ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔[3]

ڈاکٹر وزیر آغا ایک شمارہ کو دیکھ کر لکھتے ہیں:۔

پرچہ محنت سے ترتیب دیا گیا ہے اور اچھے ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے اس قسم کے پرچوں سے طلباء میں مطالعہ کا شوق بڑھتا ہے اور انہیں کچھ لکھنے کی بھی ترغیب ہوتی ہے۔

سالنامہ ۶۴ء پر تبصرہ کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب ہفت روزہ لاہور، لاہور جناب ثاقب زیروی نے لکھا:۔[4]

. . . . سب سے زیادہ صفحات اردو ادب کے لئے وقف کئے گئے ہیں جو وطنِ عزیز کی قومی زبان کا حق ہے۔ یہ حصہ صحیح معنوں میں طلبہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے۔ . . . . بحیثیت مجموعی ترتیب و تدوین حوصلہ آفریں بھی ہے اور خوش آئند بھی۔ اللہ ان وقیع نوخیز مساعی میں برکت ڈالے۔

●●●

ایک ڈاکٹر صاحب ایک آدمی کی نظر ٹیسٹ کر رہے تھے:

"لو مسٹر اب پہلی لائن کے حروف پڑھو"۔

"کونسی پہلی لائن؟" آدمی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی وہ چارٹ میں ہے، اور کونسی" ـــــ "مگر چارٹ کہاں ہے ڈاکٹر صاحب"

کچھ چونک کر ـــــ "ارے وہ سامنے کی دیوار پر لٹکا ہے"۔

"ڈاکٹر صاحب مذاق تو نہ کریں۔ سامنے تو کوئی دیوار نہیں" نابینا مریض نے بڑی حسرت سے کہا۔ (سید نصیر احمد)

---

[1] شمارہ $\frac{3+4}{9}$ ۔ [2] شمارہ $\frac{5}{13}$ ۔ [3] شمارہ $\frac{7+8}{8}$ ۔ [4] شمارہ $\frac{2}{14}$

لطف الرحمٰن محمود
ایم - اے -

اُردو شاعری کا زرّیں دَور

(قسط دوم)

"المنار" کے گذشتہ سے پیوستہ شمارے میں "اُردو شاعری کا زرّیں دور" کے عنوان سے راقم الحروف نے میرؔ و سوداؔ کے دورِ شاعری کی مندرجہ ذیل خصوصیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔

۱- مختلف اصنافِ سخن مثلاً غزل، مثنوی، قصیدہ، ہجو اور صوفیانہ شاعری وغیرہ کی ترقی۔

۲- بعض نئی اصنافِ سخن کا ظہور۔

۳- ایہام گوئی کی مضرت رساں تحریک کا انسداد۔

آج کی نشست میں اس دَور کی باقی چار پہلوؤں یعنی :-

(۱) زبان اردو کی تراش خراش۔ (۲) زبان اُردو کی وسعت اور ترقی۔ (۳) لکھنؤ پر اس دور کے شاعرانہ اثرات۔ (۴) تذکرہ نگاری کا آغاز، پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنے کی جُرأت کروں گا۔

زبانِ اُردو کی تراش خراش

لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ زبانوں کا ارتقاء ایک تدریجی عمل ہے۔ داخلی و خارجی عوامل اور محرکات کے زیرِ اثر زبانیں وقت کے ساتھ ساتھ بگڑتی یا سنورتی رہتی ہیں۔ ہر زبان کو اس دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسکے بارے میں ایک قابلِ ذکر نمایاں اور مؤثر کوشش میرؔ و سوداؔ کے عہد میں ہوئی۔ اس کے بعد ناسخؔ نے تطہیرِ زبان کے سلسلہ میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ایسی تعمیری مساعی کا سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ درحقیقت یہ صورتِ حال زبان کی زندگی، نشو و نما اور ترقی کا ایک ثبوت ہوا کرتی ہے۔ اُردو شاعری کے ابتدائی دور کے مجموعۂ کلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کی زبان میں سنسکرت، بھاشا، ہندی وغیرہ کے الفاظ کثرت سے مستعمل تھے۔ اگرچہ ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی زبان میں شامل ہو گئے تھے لیکن ہندی اور قدیم دکنی الفاظ کے بہتر فارسی متبادل تلاش کرنے کا رجحان اس دَور میں نمایاں ہو گیا۔ اس سے قبل عربی اور فارسی متبادل الفاظ و تراکیب کے صحیح استعمال کا خاص خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ مگر اس دور میں صحت کا خیال بھی مدِّنظر رہنے لگا۔ تطہیرِ زبان کی اس مہم میں ولیؔ کے دہلوی معاصر ظہور الدین شاہ حاتمؔ (سنہ ۱۱۱۱ھ تا سنہ ۱۱۹۶ھ) کے نام کو نظر انداز کرنا ناانصافی ہوگی۔ ولیؔ کا دیوان جب دہلی پہنچا تو جو لوگ اُس کے انداز سے متاثر ہوئے اُن میں شاہ حاتمؔ بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے

دیوان سے "دیوان زادہ" کا انتخاب پیش کرتے وقت اپنے اصلاحی اصول کو پیش نظر رکھا۔ انہوں نے متعدد الفاظ کی اصلاح کی۔ مثلاً :-

تسبی = تسبیح صحی = صحیح } عربی	اگانہ = بیگانہ دوانہ = دیوانہ } فارسی	اُودھر = اُدھر کیدھر = کدھر }

اسی طرح متحرک اور ساکن حروف اور مخرجین کے مسائل کی طرف بھی توجہ کی۔ مگر ہندی و سنسکرت وغیرہ کے ثقیل اور ناپسندیدہ الفاظ نکالنے میں میر درد۔ میر تقی میر اور مرزا سودا کو خاص طور پر نمایاں اور مؤثر کام کرنے کا موقع ملا۔ (میر مکین اگرچہ اتنے مشہور نہیں ہو سکے لیکن حق یہ ہے کہ انہوں نے بھی اس مہم میں تعاون کیا) حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں جو اصلاحی کام ہوا ہے اس کا مکمل جائزہ اپنی ذات میں ایک علیحدہ موضوع ہے۔ زیر نظر مختصر مضمون میں صرف چند اشارے ہی ممکن ہیں۔ تذکروں اور دیگر رسائل میں اس دور میں ہونے والی اصلاحات کی طویل فہرستیں دی گئی ہیں۔ اور طلبائے ادب کا متجسس نظر سے ان کا اوجھل رہنا بعید از قیاس ہے۔ اس دور کی چند اصلاحات مثال کے طور پر درج ذیل ہیں :-

انکھیاں	کی بجائے	آنکھیں	اچھے	کی بجائے	ہے
تمنا	"	تمہاری	مھنے	"	میں
کدھی یا کدھیں	"	کبھی	بھیتر	"	اندر۔ میں
سیتی	"	سے	اپس	"	اپنے
تئیں	"	کو	سون	"	سے
بیجلی	"	بجلی	جاری کیا ہوں	"	جاری کیا ہے میں نے
پیا۔ پیو }	"	محبوب۔ معشوق	نزدک	"	نزدیک
سریجن }		دوست	سُرج	"	سُورج
دُوجا	"	دُوسرا	آنجھو	"	آنسو
پگ	"	پگڑی	وغیرہ ۔		

ان چند مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ زبان کس حد تک صاف ہو گئی تھی۔ ادب اُردو کے ناقدین نے بھی میر و سودا کی ان خاص خدمات کو نظر انداز نہیں کیا۔ رام بابو سکسینہ اُنکے متعلق لکھتے ہیں :-

"میر و سودا کی خدمات زبان اور شاعری اور فنِ نظم کے ساتھ بہت قابلِ قدر ہیں۔ اُن کی اصلاحِ زبان کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہے۔" (ہسٹری آف اُردو لٹریچر صفحہ ۱۳۱)

"میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا۔" (ہسٹری آف اُردو لٹریچر صـ۱۳۱)

"فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات۔ استعارے اور تشبیہیں۔ طرز تخیّل اور تلمیحات زبانِ اُردو میں داخل کئے۔ اور اس اُستادی سے داخل کئے کہ اسکے جزو ہوگئے۔ اور اسکی وسعت اور لوچداری اتنی بڑھ گئی اور وُہ اس قابل ہوگئی کہ ہر ادبی کام اس سے لیا جاسکے۔" (صـ۱۳۲)

اِسی طرح ایک اور مقام پر سودا کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"چوتھی چیز ان میں تصفیہ زبان ہے۔ اِس میں کوئی شک کہ جن لوگوں نے زبان کو پاک صاف نیز وسیع کیا۔ ان سب میں مرزا کا نمبر اوّل ہے۔" (ایضاً صـ۱۴۰)

زبانِ اُردو کی وسعت اور ترقّی

زبانِ اُردو دُنیا کی چند کم عمر زبانوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے مگر اسکے باوجود دُنیا کی چند ترقی یافتہ زبانوں میں شامل ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ زبانوں کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ میر و سودا کے اس دَور میں جہاں بعض ثقیل، بوجھل اور ناپسندیدہ الفاظ سے اُردو کا دامن صاف ہوُا۔ وہاں اس دور کی مساعی کے نتیجے میں اُردو فارسی کے اور قریب ہوگئی۔ اِس وجہ سے زبان میں وسعت اور ترقی کا ایک نیا باب وا ہُوُا۔ مگر تقلید کے جوش میں یہ چھاپ بہت گہری ہوگئی۔ اور برّصغیر کی برسات کی بجائے ایران کی بہار ـــــ ہیر رانجھا کی بجائے شیریں فرہاد یا لیلیٰ مجنوں، پپیہے اور بھونرے کی بجائے بلبل و قمری اور گنگا و جمنا یا راوی و سندھ کی بجائے جیحوں اور ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیوں کی بجائے کوہ بے ستون کی گھاٹیوں کا ذکر اُردو شاعری کی روایت بن گیا۔ اِس طرح معنوی لحاظ بھی ہندوستانی مزاج اور آہنگ نظر انداز ہوگیا۔ لیکن اِس کا یہ فائدہ ضرور ہوُا کہ اُردو زبان کو نئی وسعتیں ملیں۔ یُوں تو اُردو شاعری کو فارسیّت کے قریب تر کرنے کا رجحان ولی کے دَور ہی میں پیدا ہوگیا۔ اس تحریک کے بانی سعد اللہ گلشن ہیں۔ کیوں کہ اُنھوں نے ہی ولی دکنی کو یہ مشورہ دیا :-

"یہ مضامین جو فارسی میں بیکار پڑے ہیں انہیں ریختہ میں کام میں لاؤ۔ کون تم سے محاسبہ کرے گا۔" (غزل اور متغزلین صـ۳۵)

بنیاد اگرچہ ولی نے رکھی۔ مگر کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے میر و سودا کے دور میں یہ مرحلہ زیادہ مؤثر ڈگ میں طے ہوُا۔ شعراء نے فارسی خیالات، تشبیہات، محاورات اور تشبیہات تو من و عن لے لئے گئے، اور بعض کے تراجم کرلئے گئے۔ اِس طرح زبان اُردو میں نئی تراکیب اور محاورات کا گرانقدر اضافہ ہوُا۔

اس قسم کے مفید اضافوں کی مثالیں بہت ہیں۔ صرف چند ایک بطور نمونہ پیش ہیں :-

خوش آمدن ـــــ خوش آنا گوش کردن ـــــ گوش کرنا

بُوکردن ـــــ بُوکرنا، باس کرنا۔
زنجیرکردن ـــــ زنجیرکرنا۔
قدم رنجہ کردن ـــ قدم رنجہ کرنا۔
سرکشیدن ـــــ سرکھینچنا۔
داغ شدن ـــــ داغ ہونا۔
واشدن ـــــ وا ہونا۔
سرکردن ـــــ سر کرنا۔

سرزد شدن ـــــ سرزد ہونا۔
تعب کشیدن ـــــ تعب کھینچنا
خُو کردن ـــــ خُو کرنا۔
در آمدن ـــــ در آنا۔
حرف آمدن ـــــ حرف آنا۔
دِل خون شدن ـــ دل خون ہونا
وغیرہ

اِس قسم کے بے شمار محاورات اور شعراء کے کلام میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار بھی پیش کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

"خاک برسر کردن" (سر پر خاک ڈالنا) ۔ سوداؔ ؎

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی
شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی

تر آمدن ۔ (تر کرنا ۔ شرمندہ ہونا) ۔ میر تقی میرؔ ؎

کھلنے میں ترے منہ کی کلی پھاڑے گریباں
آگے ترے رخسار کے گل برگ تر آوے

نمود کردن ۔ (ظاہر ہونا ۔ نمود کرنا) ۔ میر تقی میرؔ ؎

نمود کرکے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

"پیمانہ پُر کردن" (مار ڈالنا) ۔ مرزا سوداؔ ؎

ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا ؛ پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا

"دامن افشاندہ برخاستن" ۔ ("بیزار ہو کر اُٹھ کھڑے ہونا"۔ دامن جھاڑنا) ۔ مرزا سوداؔ ؎

کیا اس چمن میں آن کے لے جائے گا کوئی
دامن تو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا

"فلکش خبر ندارد" ۔ ("فلک کو خبر نہیں") ۔ مرزا سوداؔ ؎

تجھ رُخ میں ہے جو لُطف فلک کو خبر نہیں ؛ خورشید کیا ہے اس کی فلک کو خبر نہیں

بُوکردن - (بُو کرنا - باس کرنا) - میرؔ ؎

دیکھوں نہ کبھی گُل کو ترے منہ کے بیں ہوتے
سنبل کے سوا زُلف تری بُو نہ کروں میں

اور میرؔ کا یہ شعر تو بہت مشہور ہے ؎

گل کو محبوب ہم قیاس کیا ⁂ فرق نکلا بہت جو باس کیا

"دِل از دست رفتن" - (دِل ہاتھ سے جاتے رہنا) - میرؔ نے اس شعر میں یہ محاورہ استعمال کیا ہے - ع

"ہاتھ سے جاتا رہا دِل دیکھ محبوباں کی چال"

محاورات کے تراجم کے علاوہ ان شعراء نے فارسی کی بعض خوبصورت تراکیب کو اُسی طرح سمونے کی بھرپور کوشش کی - چنانچہ ہندی کی بعض تفاصیل تراکیب کے مقابلے پر انھیں پسند کیا جانے لگا - مثلاً :-

"تردامنی" میر دردؔ ؎ تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں،

"چراغِ سحری" - میر تقی میرؔ ؎

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے ⁂ کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

صرف میرؔ کے مجموعہ کلام پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجئے - اس قسم کی فارسی تراکیب — غبارِ ناتواں — شوق کشتہ — ہنگامہ گرم کن — حرفِ زیرلبی — دلِ غفراں پناہ — غرقِ بحرِ تحیّر — جوشِ اشکِ ندامت — آفتِ دلِ عاشقاں — وغیرہ بکثرت مل جائیں گی -

مضمون کا یہ پہلو تشنہ رہ جائے گا اگر فارسی مضامین کے تراجم کی ایک دو مثالیں پیش نہ کی جائیں -

حافظ ؎	سوداؔ ؎
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست	راز دیر و حرم افشا نہ کریں ہم ہرگز ورنہ کیا چیز ہے یاں اپنی نظر سے باہر
نظیری ؎	" ؎
بُوئے یار من ازیں سست وفامی آید ساغر از دست بگیرید من از کار شدم	کیفیتِ چشم اُسکی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
فغانی ؎	میر تقی میر ؎
مشکل حکایتے است کہ ہر ذرّہ عین اوست اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند	پایا نہ یُوں کہ کریئے اُسکی طرف اشارہ یُوں تو جہاں میں ہم نے اُسکو کہاں نہ پایا

نظیری ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

سعدی ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

عُرفی ؎

مدار صحبتِ ما بر حدیث زیر لبی است
کہ اہل بزم عوام اند و گفتگو عربی است

میر تقی میر ؎

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اُسکے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عُمر بسر ہو

میر تقی میر ؎

چاہنے کا ہم پہ یہ خوباں جو دھرتے ہیں گناہ
اُن سے بھی پُوچھو کوئی تم اتنے پیارے کیوں ہوئے؟

میر تقی میر ؎

ہر ایک سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا
شاید کہ مرے حال کا قصّہ عربی ہے

ان مثالوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس دور کے شعراء نے کس طرح فارسی مضامین کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ میر و سودا نے اس معاملہ میں بھی خاص دلچسپی لی۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں تو اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے سودا کے متعلق "سرقہ" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ عبد السلام ندوی نے سودا کی برتیت کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"اردو شاعری کو فارسی قالب میں ڈھالنا مقصود تھا۔ اس دور کے شعراء کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے۔"

(شعر الہند جلد اوّل ص ۴۶)

لکھنؤ پر اس دَور کے شاعرانہ اثرات

دہلی ایک عرصے تک اُردو شاعری کا مرکز رہا۔ اسے وہی حیثیت حاصل رہی جو جسم میں دل یا دماغ کو ہوتی ہے۔ ولی دکنی کی سعد اللہ گلشن سے ملاقات اپنے اثرات کے لحاظ سے تاریخ ادب اُردو کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اُس وقت سے شاعری کا چرچا برابر جاری رہا۔ لیکن آخری مغل تاجداروں کے عہد میں جوں جوں دہلی کی سیاسی مرکزیت ختم ہوتی گئی توں توں شاعری کی مرکزیت بھی کمزور پڑتی گئی۔ شاہ عالم ثانی کی تخت نشینی سے بھی کافی عرصہ پہلے بدامنی اور بے چینی کا آغاز ہوگیا تھا ــــ زوالِ سلطنت کی علامات نمایاں ہونے لگیں۔ نادر شاہ درانی کا حملہ ــــ مرہٹوں کا اقتدار ــــ جاٹوں کا زور ــــ بنگال میں انگریزوں کا اثر و نفوذ ــــ شاہ عالم کے اندھا ہونے کا سانحہ ــــ ان جملہ محرکات وعوامل نے شرفاء اور علماء کو خاکِ دہلی سے جُدا ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ شعراء کو بھی مجبوراً شاعری کے مرکز سے جدا ہونا پڑا۔ عبد الباری آسی اُسوقت کی دہلی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"خاندانِ تیموریہ کی طاقت قریب قریب زائل ہو چکی تھی۔ اور اب یہ خاندانی اقبال کا چراغ ٹمٹما ٹمٹما کر قضاء قدر کے ایک تُند جھونکے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس لئے طوائف الملوکی خانہ جنگی، بدامنی کا دور دورہ تھا۔ سرزمینِ دہلی ان آفتوں اور مصیبتوں کی جیسے ہمیشہ مرکز رہی ہے۔ اُسی طرح اِس وقت بھی جولانگاہِ محشر بنی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے شرفاء کو نہ وہاں اطمینان حاصل تھا اور نہ وہاں کی بود و باش کو وہ پسند کرتے تھے جس کو جہاں کہیں امن و عافیت کی جھلک دکھائی دیتی سیدھا اُدھر کا رُخ کرتا اور ہمیشہ کے لئے عمر بھر کی رفیق (دلّی) کو الوداع کہہ کر سدھار جاتا۔" (دیباچہ مثنویات میر حسن ص۲)

میر تقی میرؔ، سوداؔ اور سوزؔ ہجرت کر گئے۔ (بعد ازاں مصحفیؔ اور انشاءؔ اللہ، جرأتؔ نے بھی دہلی سے کوچ کیا)۔ میر دردؔ آخر تک وہیں ڈٹے رہے۔ لیکن اُن کے شاگرد میر حسنؔ بھی اُنہیں یہ کہہ کر رخصت ہو گئے ؎

جاناں ز تو امید نگاہے داریم — امید نگاہے ز تو گاہے داریم
اکُشتۂ چشمِ سرمہ سایت ہستم — نے نالۂ و نے فغاں نہ آہے داریم

دہلی سے شعراء کی ہجرت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ لکھنؤ میں شعراء کا ہجوم ہو گیا اور شاعری کی مرکزیت دہلی سے وہاں منتقل ہو گئی۔ اس ہجرت کے دُور رس اثرات کیا تھے؟ لکھنویت کی تحریک اور اس کی خصوصیات ..... ان تمام پہلوؤں کا تجزیہ کرنے سے قبل لکھنؤ کی ابتدائی تاریخی اور سیاسی حیثیت پر روشنی ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔

محمد شاہ کے عہد میں چند ایرانی امراء نے مغلیہ مرکز یعنی دہلی سے وفاداری کرتے ہوئے سادات بارہہ کو کچلا تھا۔ اس وفاداری کے صلہ میں سیّد محمد امین نیشاپوری نامی ایک رئیس کو "پنج ہزاری" کا منصب ملا۔ یہی محمد امین بعد میں "نواب سعادت خان برہان الملک" کے لقب سے سلطنتِ اودھ (۱۷۲۰ تا ۱۸۵۶) کے بانی بنے۔ اس خاندان کے گیارہ افراد کو اس عرصہ میں تخت اودھ پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ جن میں سے شجاع الدولہ۔ آصف الدولہ۔ اور پھر آخری تاجدار واجد علی اخترؔ خاص طور پر مشہور ہیں۔

۱۸۱۷ء تک اس خاندان کے حکمران عملاً اگرچہ خود مختار ہی تھے مگر شاہانِ مغلیہ کے احترام کی وجہ سے "نواب" کہلاتے تھے۔ مگر غازی الدین حیدر (۱۸۱۷ تا ۱۸۲۷) نے "بادشاہ" کہلانا شروع کر دیا۔ چنانچہ واجد علی اختر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

شاہانِ اودھ نسلاً ایران کے صفوی شہنشاہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ عملاً انہوں نے لکھنؤ میں اُسی مخصوص ایرانی تمدن کی یاد تازہ کردی جو آگے چل کر عیش و نشاط بلکہ تصنّع اور عریانیت کا ایک عجیب مرقع بن کر رہ گیا۔ جس سے زبان و ادب بھی خاصے متاثر ہوئے۔ اور ادب میں ایک نئی تحریک چلی، جو "لکھنویت" کے نام سے مشہور ہوئی۔

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ان شعراء نے لکھنؤ کو پناہ گاہ کیوں بنایا؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ دہلی کی بے چینی اور اضطراب اور اس کے مقابلے پر لکھنؤ کا عیش و نشاط کا ماحول اور امراء کی شاہانہ سرپرستی۔ نواب اودھ خود اچھے شاعر اور شاعروں کے قدردان تھے۔ انہوں نے ہر طرح حوصلہ افزائی کی۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نے بھی قدر دانی کو عروج پر پہنچایا۔

بہرحال دہلی کے مہاجرین شعراء نے عظیم آباد — مُرشد آباد اور لکھنؤ کا رُخ کیا۔ اور یہ مقامات بھی شعر و سخن کا مرکز بن گئے۔ لیکن اکثر کو لکھنؤ ہی میں جاکر سکون میسّر ہوا۔ اس طرح لکھنؤ شاعری کا زبردست مرکز بن گیا — عبدالسّلام ندوی کے الفاظ میں :-

"دِلّی نے قالب بدل کر گویا دُوسرا جنم لیا۔ اور شاعرانہ حیثیت سے جو مرکزیت پہلے اس کو حاصل تھی وہ لکھنؤ کو حاصل ہوگئی۔" (شعر الہند جلد اوّل ص۷۳)

صرف یہی نہ ہوا بلکہ لکھنؤ کی مخصوص ثقافت اور فضا نے اسے خاص ڈگر پر ڈال دیا۔ اور شاعری خاص لکھنؤ میں خصوصیات کی آئینہ دار ہوگئی۔ جس کی تفصیلات میں جانے کا یہ محل نہیں۔ تاہم "لکھنؤ سکول" کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہوگا۔

لکھنؤ میں شاعری کی فیّاضانہ قدر دانی کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے عبدالسّلام ندوی نے لکھا ہے :-

"شاعری اس دَور میں لازمۂ امارت بن گئی۔ اور تقریباً ہر امیر کے دربار میں .... شاعری کا ایک مخصوص صیغہ قائم ہوگیا تھا جو شعراء کی معاش اور قدر دانی کا اصل ذریعہ تھا۔"

(شعر الہند جلد ۱ ص۷۵)

لیکن اس صورت حال نے شاعر کی نفسیات پر بہت برا اثر ڈالا۔ پہلے شاعر بڑی حد تک "آزاد" تھے۔ دربارداری کے پابند نہ تھے۔ مگر یہاں آکر مُقیّد ہوگئے۔ اور انہوں نے مجبوراً وہی کچھ کہنا شروع کیا جس کی قدر دانی تھی۔ عیّاش اور شہوت پرست امراء کو جس قسم کی اشتعال انگیز عریانی پسند تھی وہ اُن کے کلام کا طُرّۂ امتیاز بن گئی۔ رام بابو سکسینہ "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" میں لکھتے ہیں لکھتے ہیں :-

"شاعری کی اس درباری وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی متانت اور پاکیزگی اور علوخیال

میں بہت فرق آگیا اور درباری اثر سے اُس کی آئندہ ترقی کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ خیالات میں نفاست اور پاکیزگی کم ہوگئی۔ شعر کی رُوحانیت اور بلند پروازی مفقود ہوگئی۔ "معشوق" سے اب تک عموماً "معشوقِ حقیقی" مراد ہوتا تھا۔ اب بجائے اس کے کوئی لونڈا یا رنڈی۔ جن کی ایسے عیش پرست درباروں میں کمی نہ تھی۔ سمجھا جانے لگا۔ شہوانی جذبات بے تکلفی کے ساتھ بکثرت نظم ہونے لگے کیونکہ عیاش امراء اور اُن کے مصاحبین اسی قسم کے اشعار سے خوش ہوتے تھے۔ اور اس قسم کے فواحش پر انعام و اکرام دیتے تھے۔" (ص ۲۰۷)

مزید براں یہ کہ لکھنؤ کی طوائفیت کے زور کی وجہ سے وہاں کی معاشرت پر نسائیت کا رنگ چھا گیا۔ چنانچہ یہاں دہلی کے ریختہ کے مقابل پر "ریختی" ایجاد ہوئی۔ جس میں کنگھی۔ چوٹی۔ سرمہ۔ مہندی۔ مسّی۔ کاجل اور دیگر زنانہ لوازمات اور عریانیت کا ذکر خوبی سمجھا جانے لگا۔

میر و سودا کے بعد ہجرت کرنے والے شعراء مصحفی۔ جرأت اور انشاء وغیرہ بھی کسی نہ کسی امیر کی بارگاہ سے متعلق رہے۔ اس صورت حال کا افسوس ناک اثر یہ ہوا کہ شعراء میں باہمی چپقلش بڑھ گئی اور ایک دوسرے کو گرا کر درباروں میں منصب حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ دہلی میں شعراء میں یہ بات نہ تھی۔ اختلافات ضرور تھے مگر بغض اور کینہ نہ تھا۔ لکھنؤ کے درباری نظام کا یہ اثر ہوا کہ شعراء جوتیوں میں دال بانٹنے لگے۔ اس درباداری نے شعراء سے بعض اہم اخلاقی قدریں چھین لیں۔ تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ لکھنؤ میں مصحفی اور انشاء کی چپقلش نے کیا صورت اختیار کی تھی؟ بحث نے مجادلے مناظرے کا رنگ اختیار کیا۔ جس نے جلسے، جلوس۔ مار پیٹ۔ سارٹ پھونک اور قتل و غارت کا رُوپ دھار لیا۔ علی نقی خاں محشر اور بعض دیگر شعراء مارے بھی گئے ـــــ شاعری کی باہمی چپقلش نے لکھنؤ کی فضا مکدر کر دی۔ اس افسوسناک صورت حال کی تصویر مصحفی نے ایک جگہ یوں کھینچی ہے:۔

ع "بزمِ شعراء ہے یہ یا مرغوں کی پالی ہے"

مزید تشریح ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

کیا چمکے اب فقط مرے نالے شاعری ❊ اس شہر میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری
سامان سب طرح کا ہو لڑنے کا جنکے پاس ❊ ہے آج کل انہی کی مسالے کی شاعری
شاعر رسالہ دار نہ دیکھے ہیں نہ سُنے ❊ ایجاد ہے اُنہی کی رسالے کی شاعری

مرزا سودا نے بھی اس قسم کے مجادلہ رنگ کی اپنے اشعار میں مذمت کی ہے ـــــ یہ تکدر اور چپقلش اُردو شاعری کے زرّیں دور کا ایک "کارنامہ" نہیں۔ ہاں اس چپقلش کا ایک مثبت پہلو مفید بھی ثابت ہوا۔

اصل کارنامہ تو ایک اور مرکز شاعری کا ظہور ہے، جو منفی اثرات کے علاوہ بعض مفید مثبت اثرات کا حامل بھی ہے۔

اگر شعراء کی یہ باہمی چپقلش مسابقت کی تعمیری روح کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی تو غالباً اردو شاعری کے لئے یہ پہلو نہایت مبارک ثابت ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ بغض و حسد نے اس جذبے کے اصل حسن کو نکھرنے نہ دیا۔ تاہم کچھ نہ کچھ تعمیری اثر ضرور باقی رہا ـــــ مقابلہ میں مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا رجحان بڑھا۔ چنانچہ اس دھن میں نئی نئی مشکل زمینیں نکالی گئیں۔ اسکے علاوہ مسلسل گوئی بھی معرضِ وجود میں آئی۔ دہلی سکول نے مختصر غزل کو پسند کیا تھا۔ ولی۔ میر درد۔ میر تقی میر نے مختصر غزلیں ہی لکھیں۔ لیکن لکھنؤ سکول نے ایک ہی زمین میں متعدد غزلیں لکھنے کو پسندیدہ سمجھا۔ چنانچہ دو غزلے، سہ غزلے اور چہار غزلے ظہور میں آئے۔ ـــــ جرأت اور سعادت یار خاں رنگین مسلسل گوئی کے لئے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا نے کہیں مسلسل گوئی کو اختیار کیا ہے مگر "عیب" سمجھ کر۔ لیکن لکھنؤ سکول میں غزل کے اشعار کی تعداد کو قصیدے کے اشعار کی تعداد کے قریب کر دیا۔ اس شوق کی وجہ سے زبان کے سرمائے میں اضافہ ضرور ہوا۔ اور دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس دور میں لکھنؤ میں شاعری کا جو چرچا ہوا تھا۔ اس نے آگے چل کر اردو ادب کے ایک خاص اسلوب کا روپ دھار کر ایک علیحدہ سکول کی حیثیت اختیار کر لی جو تاریخ ادب اردو کا ایک اہم واقعہ ہے۔

(باقی)

مختصر کہانی

"جوگیا کو اپنے بھائی کا تار ملا جو اس کے شوہر کے ساتھ شکار پر افریقہ گیا تھا۔ تار کے الفاظ یہ تھے:۔

"تمہارا شوہر شیر کے شکار میں آگیا ہے"۔

جوگیا نے فوراً تار دیا کہ اس کی لاش گھر بھیج دو۔ تین ہفتے بعد ایک بڑا بکس افریقہ سے پہنچا جس کے اندر شیر کی لاش بند تھی۔ جوگیا نے پھر تار دیا

"تم سے غلطی ہوئی۔ میرے شوہر کی لاش بھیج دو"

اُس نے جواب دیا۔

"مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔ تمہارا شوہر بھی شیر کے اندر ہے"۔

(عطاء الطیب راشد)

مرزا محمد لقمان احمد
ایف۔ ایس۔ سی (سال اوّل)

مشاہیرِ سائنس

ذیل میں گزشتہ صدی کے بعض نامور سائنس دانوں کے حالاتِ زندگی، ایجادات اور کارہائے نمایاں مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تمام غیر مسلم اقوام میں سے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علوم جدیدہ صرف غیر مسلم اقوام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام قسم کے علوم میں ابتدائی کام مسلمانوں نے ہی شروع کیا تھا۔ لیکن جب مسلمان اپنے اصل راستہ سے ہٹ گئے۔ تو غیر اقوام نے مسلمانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ اور ان کے طریقِ کار کو اپنا کر انہوں نے کام شروع کیا اور موجودہ اعزاز حاصل کیا۔

ہمیں یہ اعزاز واپس لینا چاہیئے۔ اور سائنس کو بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے وقف کر دینا چاہیئے۔ بجائے اسکے کہ سائنس کی وجہ سے جنگ اور بدامنی کے مہیب بادل اُٹھیں جیسا کہ آجکل ہیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ہم غلط تقلید کو چھوڑ دیں اور صحیح روایات کو اپنائیں۔

فرانسیسی ماہر ریاضیات "اینڈرے ایمپیئر" (۱۷۷۵ تا ۱۸۲۶ء)۔ "اینڈرے ایمپیئر" فرانس کے پولی ٹیکنیک کالج کا پروفیسر تھا۔ اس کے علاوہ وہ "کالج ڈی فرانس" میں طبیعات کا پروفیسر بھی رہا۔ وہ اپنے گھر میں تجربات کیا کرتا تھا۔ اس نے چند ہفتوں کے اندر مقناطیس اور برقی رو کے درمیان قوت کے تمام قوانین معلوم کئے اور متعلقہ نظریات بھی پیش کئے۔ اسے "برقی حرکیات" کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ برقی رو کی اکائی "ایمپیئر" اسی کے نام سے موسوم ہے۔

انگریز کیمیادان "سر ہمفری ڈیوی" (۱۷۷۸ تا ۱۸۲۹ء)۔ ڈیوی نے ۱۷۹۹ء میں نائٹرس آکسائیڈ پر تجربات کر کے معلوم کیا کہ اس میں جسم کو سُن کر دینے کی عجیب و غریب خاصیت پائی جاتی ہے۔ ۱۸۰۷ء میں انہوں نے القلی دھاتوں سوڈیم، اور پوٹاشیم کو ان کے مرکبات کاسٹک سوڈا اور کاسٹک پوٹاش سے برقی تجزیہ کے ذریعے حاصل کیا۔

برق پاشیدگی پر غور کرنے کے بعد "ڈیوی" نے بجلی اور کیمیا کے تعلق کی طرف اشارہ کیا جس کی تصدیق ۱۰۰ سال بعد ہوئی۔

ڈیوی نے فیراڈے کو ساتھ لیکر یورپ کا سفر کیا۔ پیرس میں "اینڈرے ایمپیئر" نے "ڈیوی" کو ایک نئی چیز

تحفہ کے طور پر دی۔ ڈیوی نے اس پر تجربات کر کے اس کے خواص معلوم کئے اور اس کا نام "آیوڈین" رکھا۔
واپسی پر ڈیوی نے مشتعل ہونے والی گیسوں پر تجربات کئے اور مشہور عالم "سیفٹی لیمپ" ایجاد کیا۔ جو کہ کانوں میں استعمال ہوتا ہے جس نے ڈیوی کے نام کو زندہ رکھا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اساس (الکلی) آکسیجن اور کسی دھات کا مرکب ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ تیزابوں میں تیزابیت ہائیڈروجن پر منحصر ہوتی ہے۔ ۱۸۰۸ء میں انہوں نے "بیریم" اور "سٹرانشیم" نامی عناصر حاصل کئے اور "لیتھیم" دریافت کیا۔ "میگنیشیم" دھات کو آپ نے ہی اس کے مرکبات سے جدا کیا۔

انگریز ماہر طبیعات و کیمیا "مائیکل فیراڈے"۔ (۱۷۹۱ تا ۱۸۶۷ء)۔ "فیراڈے" ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن میں ایک جلد ساز کی دکان پر کام کیا۔ سائنس کی کچھ کتابیں پڑھنے کے بعد اس نے "ڈیوی" کے لیکچر سننے اور ان پر نوٹ تیار کئے۔ "ڈیوی" نے اس کی تحریرات سے متأثر ہو کر ۱۸۱۳ء میں "فیراڈے" کو اپنے مددگار کے طور پر رکھ لیا۔ یورپ کے سفر میں یہ "ڈیوی" کے ساتھ تھا۔

"فیراڈے" نے بہت تیزی سے ترقی کی اور "رائل انسٹی ٹیوٹ" میں کیمیا کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ اسکی شہرت کا دار و مدار "برقی مقناطیسی امالہ" کی دریافت پر ہے۔ ۱۸۳۱ء میں "فیراڈے" نے یہ معلوم کیا کہ اگر مقناطیسی میدان میں کسی موصل کو حرکت دی جائے تو اس موصل میں برقی رو پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس نے "جنریٹر" تیار کرنے کا عملی طریقہ دریافت کر لیا جس کے فوائد کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

"فیراڈے" نے برق پاشیدگی پر بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ برقیرہ (ELECTROD) مثبت برقیرہ (ANOD) منفی برقیرہ (CATHOD) رواں (ION) اور روانیت (IONILATION) وغیرہ اصطلاحات "فیراڈے" کی وضع کردہ ہیں۔ اس نے ثابت کیا کہ "تجزیئے" یا تحلیل کا انحصار "برقی قوت" اور اس کے وقت پر ہوتا ہے اور یہ کہ ملمع کے وزن کا تعلق اس کے مساوی کیمیائی وزن سے ہوتا ہے۔

برقی گنجائش (CAPACITY) کی اکائی "فیراڈ" اس کے نام کو ہی تازہ کرتی ہے۔

سکاٹ لینڈ کا موجد "گراہم بیل" (۱۸۴۷ تا ۱۹۲۲ء)۔ "گراہم بیل" سکاٹ لینڈ کے ایک استاد کا بیٹا تھا۔ جو کہ گونگوں اور بہروں کو پڑھایا کرتا تھا۔ "بیل" نے "ایڈنبرا"۔ "لنڈن" اور "جرمنی" میں تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ پہلے "کینڈا" اور پھر ۱۸۷۱ء میں "امریکہ" چلا گیا اور "بوسٹن" میں صوتی فزیالوجی کا پروفیسر مقرر ہو گیا جہاں وہ گونگوں اور بہروں کو اپنے باپ کے ایجاد کردہ طریقے سے پڑھایا کرتا تھا۔ اس نے ٹیلیفون ایجاد کیا جس کے مفید ہونے میں کسی کو کلام نہیں اور ۱۸۷۶ء میں اس کی نمائش کی۔ اس نے فوٹو فون اور گرافوفون بھی ایجاد کیا۔ جو گراموفون کی ابتدائی شکل تھا۔

عادی دُنیا کی مشہور ترین عورت پولینڈ کی ماہرِ طبیعات و کیمیا "میری کیوری" (۱۸۷۶ تا ۱۹۳۶ء)۔ "کیوری" نے پیرس میں تعلیم پائی اور اپنے شوہر کے ساتھ "ریڈیم" دریافت کیا جس سے ان کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں اس نے "یورانیم" کی کچ دھات پر تجربات کئے اور "پولونیم" جُدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ دیگر اَن گنت اعزازات کے علاوہ ۱۹۰۳ء میں اپنے شوہر کی معیّت میں فزکس کے "نوبل پرائز" کی حقدار قرار دی گئی۔ اِس کے بعد ۱۹۱۱ء میں پھر اس کو کیمیا کا نوبل پرائز ملا۔ اِس طرح "کیوری" دوبارہ نوبل پرائز حاصل کرنے والی پہلی خاتون تھی۔ ۱۹۶۲ء تک یہ اعزاز کسی مرد کو نصیب نہیں ہو سکا تھا۔

۱۹۶۲ء میں "ڈاکٹر لینسی پولنگ" نے امن کا نوبل پرائز لے کر یہ ریکارڈ توڑ دیا۔ ڈاکٹر لینسی پولنگ اس سے قبل ۱۹۵۴ء میں کیمیا کا نوبل پرائز لے چکے تھے۔

البرٹ آئن سٹائن (۱۸۷۹ء تا ۱۹۵۵ء) دورِ حاضر کا عظیم ترین آسٹرین ماہرِ ریاضیات و طبیعات، آئن سٹائن نے زیورچ میں تعلیم پائی اور "برن" کے پیٹنٹ آفس میں اگزامینر مقرر ہو گئے۔ انہوں نے روشنی اور بجلی کے درمیان تعلق معلوم کیا اور اپنے مشہور عالم "نظریہ اضافت" کے متعلق ابتدائی خیالات پیش کئے۔ آپ کچھ عرصہ "برلن" میں بھی پروفیسر رہے۔ لیکن یہودی ہونے کی وجہ سے جرمنی میں آپ پر سخت مظالم ڈھائے جاتے۔ آخر کار ۱۹۳۳ء میں نازی جبر و تشدد سے تنگ آکر آئن سٹائن اپنے عہدے اور جرمن شہریت دونوں سے دستبردار ہو گئے۔ وہ آزادی کی تلاش میں امریکہ گئے جہاں ۱۹۴۰ء میں انہیں "پرنسٹن" یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ "آئن سٹائن" نے اپنا خاص "نظریہ اضافت" ۱۹۰۵ء میں پیش کیا جس کا تعلق برقی حرکیات سے ہے۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے فزکس کا نوبل پرائز حاصل کیا۔ ۱۹۲۵ء میں انہیں "رائل سوسائٹی" کا کوپلے میڈل ملا۔

"کوپرنیکس" کے بعد آئن سٹائن ہی وہ شخص ہے جس کے خیالات و نظریات نے عالم سائنس میں ایک خاموش انقلاب برپا کیا۔ انہوں نے ۱۹۵۰ء میں برقی مقناطیسیت اور کششِ ثقل کے چند مخصوص نظریے وضع کئے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ آئن سٹائن نے روشنی پر کششِ ثقل کے اثر، روشنی اور بجلی کے باہمی تعلق کی وضاحت کی۔

آپ کو جدید سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے اور آپ کو زمانہ حال کے بہترین ریاضی دانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دُنیا کے اس عظیم ترین ریاضی دان کے متعلق ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔

ایک دفعہ آپ ٹرام میں سفر کر رہے تھے۔ آپ نے کنڈکٹر کو ٹکٹ کے لئے نقدی دی۔ کنڈکٹر نے جب بقیہ رقم واپس دی۔ تو آپ نے کہا کہ رقم کم ہے۔ اسپر اس کنڈکٹر نے کہا کہ تمہیں شاید گننا نہیں آتا۔

آپ کے اعزاز میں تابکار توانائی کی اکائی "آئن سٹائن" کہلاتی ہے۔

ہدایت اللہ ہادی

اُردو بحیثیت "قومی زبان"

اُردو زبان کی ابتداء کے بارے میں آج تک بہت سی باتیں کہی جا چکی ہیں۔ اس بارے میں محققین حضرات کا نظریاتی تصادم اِس قدر شدید ہے کہ کوئی اس کی ابتداء کو شاہجہان کے عہد سے منسوب کرتا ہے تو کوئی دُوسرا اسے اس سے بھی پہلے کی زبان ثابت کرتا ہے۔ بعض کے خیال میں یہ زبان اُس وقت بنی جبکہ مسلمانوں نے برِّ صغیر ہند و پاک میں قدم رکھا۔ مولینا محمد حسین آزاد اپنے رسالہ "آبِ حیات" میں لکھتے ہیں۔ کہ اُردو بَرِج سے نکلی ہے۔ جو دہلی اور دوآبے کے گرد و نواح کی زبان تھی۔ اِس زبان میں سب سے پہلے لکھنے والے امیر خسرو تھے۔ جنہوں نے فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی نظمیں کہیں۔ ان کی مشہور و معروف کتاب "خالقِ باری" میں بھی اُردو کا بہت سا حصہ ہے۔ ان کی نسبتیں تو خاص طور پر مشہور ہیں۔

اس سے قبل یہی خیال کیا جاتا تھا کہ اُردو نے پوری طرح مغلیہ لشکروں میں ہی جنم لیا تھا۔ ترکی زبان میں لفظِ "اردو" کے معنے "لشکر یا گروہ" کے ہیں۔ پس اس سے لوگوں کو خیال گذرا کہ یہ صرف لشکریوں کی ہی زبان تھی۔ یہ زبان مغلیہ لشکروں کے ذریعہ اس ملک میں آئی۔ اور ان کے وسیلے سے یہاں پھیلی۔ اور دہلی اُردو زبان کا مرکز بنا۔ رفتہ رفتہ یہ زبان ترقی کر کے "اردوئے معلّٰی" کہلائی۔

دہلی اور لکھنؤ کے رہنے والوں کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ زبان یہیں پیدا ہوئی۔ اور یہیں پروان چڑھی۔ اور یہیں اس کی تالیف و تصنیف ہوئی۔ مگر ان باتوں کے ساتھ ساتھ دکن کے لوگ بھی اس بات کے دعویدار ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی اپنی کتاب "دکن میں اُردو" میں یُوں رقمطراز ہیں کہ "کہ یہ زبان دکن میں پیدا ہوئی۔ اور "اُردو" کی شروع شروع کی کتب بھی دکن ہی میں لکھی گئیں"۔ حافظ محمود شیرانی اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں لکھتے ہیں۔ "کہ اردو کے صرفی اور نحوی قاعدے اور کلیّے یہ پتا دیتے ہیں کہ اسے پنجاب سے بڑی گہری مناسبت ہے"۔ حافظ صاحب کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ گو محمد بن قاسم سے قبل پنجاب اور سندھ کے لوگوں میں کچھ میل جول ہو چکا تھا۔ مگر محمود غزنوی کے مشہور سترہ حملوں نے انسانی نسلوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اوّل مسلمان۔ دوم قدیم باشندے ـــــ محمود غزنوی کی وفات کے بعد ایک سو سال تک حکومت رہی۔ عام لوگ سرکاری معاملات اور تجارت کی غرض سے پنجاب میں آباد ہو گئے۔ مسلمان فارسی بولتے تھے۔ اور قدیم باشندے قدیم ہندی یا

پراکرت بولا کرتے تھے۔ غرض مسلمان اور قدیمی باشندوں کے باہمی میل جول سے ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آئی۔ جو کہ بعد میں اُردو کہلائی۔

سب سے پہلے یہ زبان دہلی میں "ٹیکسالی" کے نام سے پکاری گئی۔ پھر دہلی کی رعایت سے کوئی اسے "دہلوی" کہتا۔ کوئی اسے "گجراتی" کہتا۔ کوئی "دکنی" کہتا۔ یورپین اسے "ہندوستانی" کہتے۔ اور بعض اسے "ہندی یا ہندوی" کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن سب سے مقبول نام "ریختہ" تھا۔ "ریختہ" فارسی کا لفظ ہے۔ اسکے معنے "گری ہوئی" چیز کے ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کیونکہ یہ مخلوط زبان ہے اور تمام الفاظ مختلف زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ اِس لئے اس کا نام "ریختہ" تھا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ "ریختہ" کے معنے "چونا گچ" کے بھی ہیں۔ جو دیوار کو پختہ کرنا ہے۔ چونکہ اس زبان میں پختگی پائی جاتی ہے۔ اِس لئے اس کا نام "ریختہ" تھا۔ تیسرا خیال یہ ہے کہ "ریختہ" کے معنے "موزوں قالب میں ڈھالنے" کے بھی ہیں۔ چونکہ یہ زبان موزوں قالب میں ڈھالی گئی ہے اِس لئے بھی اس کا یہ نام موزوں ہے۔ پہلے پہل لفظ "ریختہ" اردو شاعری کے لئے مستعمل و مقبول تھا۔ جیساکہ غالبؔ اور دیگر دوسرے شعراء کے بیشتر اشعار اس لفظ کے کثرتِ استعمال پر دال ہیں۔ خصوصاً غالبؔ کے ایک مقطعہ میں فارسی غزل سے اردو غزل کے تقابل کیلئے لفظِ "ریختہ" ہی استعمال کیا گیا ہے۔ ع

جو کہے تجھ سے کیونکہ ہے "ریختہ" رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کر اسے سُنا کے یُوں

پھر بعد میں یہ لفظ اُردو نثر میں بھی استعمال ہونے لگا۔ انیسویں صدی میں یہ لفظ عام ہوگیا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ لفظ بھی متروک ہوتا چلا گیا۔ بالآخر اُردو کا لفظ ہی مقبول ہوگیا۔ سرسید احمد خاں کے نزدیک "اردو" فارسی کا لفظ ہے۔ اس کے معنے "بازار" کے ہیں۔ غرض اب اس کے لئے کوئی دوسرا لفظ زبان پر نہیں آتا۔ جس طرح زبان پیاری ہے اسی طرح ہمیں یہ لفظ پیارا ہے۔

اگرچہ اُس وقت دفتری اور شاہی زبان فارسی ہی تھی۔ پھر بھی اِس نے کافی ترقی کی۔ کیا مسلمان سپاہی، کیا اہلِ حرفہ، کیا صنّاع، کیا تجّار اور کیا فقراء درویش غرضیکہ سب ہی اُردو ہی بولتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنھوں نے شروع شروع میں شعر کہے وہ فقراء اور درویش لوگ ہی تھے۔ آہستہ آہستہ اُردو زبان ترقی کرتی چلی گئی اور دکن میں درباروں تک رسائی ہوگئی۔ اور دکن کے مشہور اُردو شاعر ولیؔ نے اپنی شاعری سے شمالی ہند اور دکن میں اردو کے لئے بہت جگہ پیدا کر دی۔ اور تھوڑے عرصہ بعد میر تقی میرؔ، مضمونؔ، آرزوؔ، حاتمؔ اور سوداؔ جیسے باکمالوں نے اپنی شاعری سے اُردو کو چار چاند لگائے۔ اور اُردو ادب میں بے انتہا اضافے کئے۔ ان کی خدمات ہمارے لئے ناقابلِ فراموش ہیں۔ اور اُردو ادب کی تاریخ بھی انہیں کی

مرہونِ منّت ہے۔

غرض دہلی میں اُردو زبان نے بہت ترقی کی اور وہاں کے شہزادوں نے اسے فارسی کی جگہ دے دی۔ اِس کے بعد اس نے لکھنؤ میں بھی کافی ترقی کی۔ اور یہ بھی دہلی کی طرح اُردو کا مرکز بن گیا۔

یہاں تک تو اُردو زبان کی ابتدا اور اسکی عہدِ بعہد ترقی کا نہایت ہی مختصر اور اجمالی سا جائزہ تھا۔

میرا اصل مقصد یہ ہے کہ مَیں آپ لوگوں کو یہ بتاؤں کہ آج پاکستان میں ہم لوگوں کیلئے بحیثیت ایک قوم کے اُردو زبان سے متعلق کیا فرائض ہیں؟ اور ہماری قومی زندگی میں اسکی کیا اہمیّت ہے؟ اور یہ زبان ہماری قومی زبان کیوں ہے؟

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب برِّصغیر ہند و پاک مکمل طور پر انگریزوں کے زیرِ حکومت آگیا۔ تو ہندوؤں میں پہلی بار قومی احیاء کا شعور پیدا ہوا۔ چنانچہ آریائی تحریک انگریزوں کی حکومت کے خلاف ایک ذہنی ردِّ عمل ہی کا دُوسرا نام ہے۔ اس تحریک کا مقصد ملک میں آریائی تہذیب، آریائی کلچر، آریائی مذہب اور سنسکرت زبان کا فروغ تھا۔ چنانچہ اُردو زبان کے خلاف برِّصغیر ہند و پاک میں اُسی وقت سے نفرت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اِس کی انتہاء کا زمانہ ۱۹۴۷ء تقسیمِ ملک کے قریب قریب کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں کی جہاں یہ کوشش تھی کہ مسلمان۔ برطانوی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد ان کے دستِ نگر ہو جائیں اور معاشی و اقتصادی طور پر ہندوؤں کی برتری کو تسلیم کرلیں۔ وہاں ان کی ایک کوشش یہ بھی تھی کہ مسلمان لسانی لحاظ سے بھی غلام بنالئے جائیں۔ چنانچہ اُس وقت سے لیکر آجتک ہندوستان میں سرکاری طور پر اُردو کی جو حالت ہے وہ واضح ہے۔ لیکن یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ خود ہماری اپنی حکومت اور عوام کا رویّہ بھی اُردو زبان کے ساتھ انتہاء درجہ منفی ہو۔

ہندوؤں کو عموماً اور ہندو لیڈروں کو خصوصاً ذہنی طور پر اِس امر کا شدّت سے احساس تھا۔ کہ اُردو زبان مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے مسلمانوں ہی نے اِس زبان کا بیج بویا ہے۔ اور مسلمانوں ہی نے اس کی آبیاری کی ہے۔ اور اس کو پروان چڑھایا ہے۔ اور اسی نام پر مسلمانوں نے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ بھی کیا۔

مولٰنا صلاح الدین احمد مرحوم "ادبی دُنیا" میں لکھتے ہیں۔ "غور کا مقام ہے کہ جس زبان کو اپنا خون پلا پلا کر اِس قابل کیا تھا کہ وہ دُنیا کی بہترین زبانوں سے آنکھ ملا سکے۔ جو زبان اپنی بے مثال صلاحیتوں کے اعتبار سے آج زبانوں کی صفِ اوّل میں ایک مقام امتیاز رکھتی ہے اور جسے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد دُنیا بھر میں تیسرے نمبر پہ ہے۔ وہ زبان آج اپنے زادِ بوم میں غریب الوطن ہے"۔

کسی ملک میں ایک قومی زبان کا ہونا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ تو اس کو سمجھنے کے لئے اس ذہن کی ضرورت ہے جس میں اپنے تہذیب و تمدّن کی ترقی، وطن کی سلامتی اور اس کی بقاء کے لئے کوئی تڑپ کا جذبہ اور کوئی خواہش ہو۔ یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے ایک قوم کے افراد کا ذریعۂ اظہارِ خیال مختلف زبانوں میں ہے۔ اِس طرح ملک اور قوم میں انتشار پھیلتا ہے۔ اور وہ یکجہتی نہیں ہو سکتی جو کہ قوموں کی جان ہوا کرتی ہے۔ یکجہتی اور وحدت ہی ہمارے نسلی امتیازات، مذہبی اور علاقائی تعصبات کا قلع قمع کر سکتی ہے اور وہ تمام شرمناک اختلافات جو اس وقت ادنیٰ خود غرضیوں کی بدولت بہت بُرے نظر آتے ہیں، مٹ سکتے ہیں۔ جس سے ہمارے علم و ادب، ثقافت اور تہذیب و تمدن کو فروغ مل سکتا ہے۔

جب ہم اُردو کے لئے قومی زبان کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ملک اس کے صحیح مقام کی نشاندہی کرتا ہے تو ہمارے ذہنی پس منظر میں اس کا تصادم بالخصوص انگریزی زبان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمیں اِس بات سے انکار نہیں کہ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے۔ "ادبی دُنیا" میں مولٰنا صلاح الدین احمد مرحوم یُوں رقمطراز ہیں:۔

"مانا کہ ہمیں سائنس کی ترقی سے ہمقدم رہنے کیلئے انگریزی کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو ضرور پُورا کیجئے لیکن صرف ضرورت کی حد تک۔ اِس زبان کے بازاری عشق میں مبتلا ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے"۔

اگر ہماری نسلِ نو کی پرورش میں انگریزی زبان کو ان پر پوری طرح مسلط کر دیا گیا تو انگریزی زبان سے انکے اتنے گہرے تعلق کا نتیجہ نفسیاتی طور پر یہ ہوگا کہ نئی نسل ذہنی طور پر انگریزی تہذیب، انگریزی تمدّن اور انگریزی کلچر کے قریب تر ہوتی چلی جائیگی۔ اور بلاشبہ اُن کا جسم تو پاکستانی ہی ہوگا۔ لیکن ذہن انگریزی ـــــ اور انہیں اپنی قوم، اس کی روایات اور اس کی تہذیب سے دُور کا بھی علاقہ نہ ہوگا۔ اِس طرح زمانہ ہمیں بحیثیت ایک تہذیبی اور قومی اکائی کے پہچاننے سے انکار کر دے گا۔

رہا یہ سوال کہ ہم نے قومی زبان منتخب کرتے ہوئے اُردو کو کیونکر چُنا ہے۔ تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ اس زبان میں ہم سب کا خون شریک ہے۔ یہ کسی ایک قوم یا کسی ایک نسل یا کسی ایک صوبے سے مخصوص نہیں۔ بلکہ ہم سب کی مشترکہ زبان ہے۔ کوئی بھی اِس کو بیگانہ نہیں سمجھتا۔ اور نہ ہی اِس کا کوئی ایک دعویدار ہو سکتا ہے۔ اور اردو زبان ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ شانہ بشانہ مُسکراتی ہوئی چلتی ہے۔ اس کا شمار بھی دنیا کی فصیح ترین زبانوں میں ہونے لگا ہے۔ اِس زبان کو سمجھنے والے نہ صرف اپنے ملک میں ہی پائے جاتے ہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اس کے جاننے بُوجھنے والے مل جاتے ہیں۔ اور زبان میں ذخیرۂ الفاظ بکثرت موجود ہے۔ مطالب و مفاہیم پر پوری قدرت رکھتی ہے۔ ہمارا تمام علمی و ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ بھی اِسی زبان میں ہے۔ غرض اُردو زبان کے اندر اور بھی متعدد خصوصیات ہیں جو دیگر زبانوں سے مابہ الامتیاز ہیں۔ اِس میں وہ

تمام محاسن پائے جاتے ہیں جو ایک قومی زبان کے اندر پائے جانے چاہئیں۔ اسی لئے ہم نے بحیثیت قومی زبان کے اُردو ہی کو منتخب کیا۔

سو اب ہمیں اس کی قدر و منزلت کو پہچاننا چاہیئے۔ اور اس کو اس کا صحیح مقام دلانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ "قومی زبان" میں بابائے اُردو مولٰنا عبدالحق مرحوم یُوں رقمطراز ہیں :-

"وہ زبان جسے ہمارے اسلاف نے اور ہمارے شاعروں، ادیبوں اور علماء نے اپنی پیہم کوششوں اور اپنی دماغی، ذہنی، اخلاقی اور رُوحانی کاوشوں سے ایسا پُرمایہ شائستہ اور وسیع بنا دیا۔ کہ وہ دُنیا کی شائستہ زبانوں کی صف میں کھڑی ہو سکتی ہے۔ وہ زبان جو برِّصغیر پاک و بھارت میں سب سے مقبول اور عام ہے اور برِّعظیم سے باہر دُور دُور تک جا پہنچی ہے۔ وہ زبان جس کی حمایت میں سر سیّد احمد خاں مرتے دم تک اسکے دشمنوں سے لڑتے رہے۔ وہ زبان جس کے لئے نواب محسن الملک نے یُوپی کے گورنر سے ٹکر لی۔ وُہ زبان جس کا نام لیکر مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اسے اِس برِّعظیم کی عام زبان بنانے کی قرارداد منظور کی۔ وُہ زبان جس کے تحفظ کیلئے انجمن ترقّیٔ اُردو نے کانگرسی حکومتوں اور اُنکے ناخدا گاندھی جی سے معرکہ آرائیاں کیں اور مخالفوں کو نیچا دِکھایا۔ وُہ زبان جسکی خاطر قائدِ اعظمؒ نے جان جوکھوں میں ڈال کر ڈھاکے کا پُرخطر سفر اختیار کیا اور نہایت ہی غیر مبہم الفاظ میں علی الاعلان فرمایا :-

"کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہی ہوگی۔ اور جو لوگ اس کے خلاف غلط فہمی پَیدا کرنا چاہتے ہیں، وُہ پاکستان کے دشمن ہیں۔"

حاضر جوابی

امریکہ کا صدر لنکن بڑا حاضر جواب شخص تھا۔ ایک بار کسی ملک کا سفیر اس کے کمرے میں ناگہاں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ اپنا جوتا صاف کر رہا ہے۔ اس نے حیرت سے پوچھا

"کیا آپ اپنا جوتا صاف کر رہے ہیں؟"

لنکن نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ لیکن کیا آپ دوسروں کے جوتے صاف کرتے ہیں؟"

(مرسلہ:- سیّد ناصر احمد سال اوّل)

محمد منظور صادق
بی، اے۔ سال دوم

مخدوم بننے کا راز

یہ دنیا ایک سرائے فانی ہے اور زندگی ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے۔ بے شمار لوگ اِس چراغِ زیست سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب دُنیا سے رخصت ہونے کا وقت آتا ہے تو کوئی دنیا کو روتے ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن پر اہلِ دنیا غم و حزن کے آنسو بہاتے ہیں۔ دُوسرے زمرہ کے ان محبّانِ انسانیت کے متعلق شاعر نے کہا ہے ؎

تیرے جانے کا نہیں رندوں کو تنہا افسوس
ساقیا غم میں ترے روتے ہیں پیمانے تک

لوگ اُن مقدس اور بزرگ انسانوں کو یاد کر کے روتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں بنی نوع انسان کی خدمت میں صرف کر ڈالیں۔ اور اس حد تک خدمت کی کہ بالآخر خود مخدوم بن گئے۔ پس مخدوم بننے کا راز یہ ہے کہ انسان اپنی ساری زندگی انسانیت کی خدمت میں خرچ کر ڈالے۔

ایسے لوگوں میں اوّل انبیاء علیہم السلام کا نمبر آتا ہے۔ یہ لوگ شفقت علیٰ خلق اللہ میں سب سے بڑھ کر رحیم اور مہربان ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی خدمتِ خلق کے لئے وقف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی وفات پر ہر ایک صاحبِ ایمان اپنے آپ کو یتیم سمجھتا ہے۔ کیونکہ ان مقدس وجودوں کی زندگی سے ہی اُن کی زندگیاں پیوست ہوتی ہیں۔ یہی وُہ غمِ رحلت تھا جس نے حسّان بن ثابت کو یہ کہنے پر مجبور کیا ؎

كنت السّواد لناظري
فعمي علىّ الناظرُ
من شاء بعدك فليمت
فعليك كنت احاذر

کہ اے رسول تُو تو میری آنکھ کی پُتلی تھا۔ اب تیری وفات سے مَیں اندھا ہو گیا ہوں۔ اب جو چاہے مرے مجھے اِس سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ مجھے تو صرف تیری وفات کا ہی ڈر تھا۔

انبیاء اور اُن کے بعد اُن کے پیرو کار حقیقی طور پر مخلوق کے غمگسار اور خیر خواہ ہوتے ہیں۔ خدمتِ خلق اُن کا شیوہ اور عادتِ ثانیہ ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے اور ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ یہی لوگ مخدومیت کا جامہ زیب تن کرتے ہیں ـــــ وُہی ابوہریرہؓ جن کو ضعفِ گُرسنگی سے بیہوش پاکر لوگ، مرگی کا مریض سمجھ کر جوتے مارتے تھے، آخر یمن کے گورنر کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے ـــــ وُہی بلالؓ جنہیں عرب کے تپتے ریگ زاروں پر گھسیٹا جاتا تھا، فتح مکّہ کے دِن علمبردارِ رسالت بنے اور مکّہ کے خونخوار سرداروں نے آپ کے زیر سایہ امان لی، اور اُن کی گردنیں آپ کے سامنے خم کردی گئیں۔

یہ سب کچھ محض اور محض اُن خدمات کا صلہ تھا جو ابتدائے زمانۂ اسلام میں آپ نے بجالائیں۔ پس اُن کی خدمات اور قربانیوں کو نوازا گیا اور دُنیا کے اُستاد اور مخدوم ٹھہرے۔

مگر شائد بعض اذہان اِن امثلہ کو میرے ذاتی ذوق اور مذہبی اعتقاد پر محمول گردانیں، لہذا اِس حقیقت کے ثبوت میں چند اور محبوبِ اقوام اور ہر دلعزیز ہستیوں کو پیش کیا جاتا ہے تا یہ بات ثابت ہو کہ جو شخص بھی خدمتِ خلق کو زندگی کا فرضِ اوّلین سمجھتا ہے وُہ کس طرح گمنامی و بےبسی کی زندگی سے ایک حیاتِ جاوداں اور مخدومیّتِ خلق کا درجہ پاتا ہے۔ جس شخص نے بھی خادمِ خلق کا جامہ زیب تن کیا وہ مخدومِ انسانیت کی حیثیت سے اپنی محبّت قلوب میں چھوڑ گیا۔

یہ بات مدِّ نظر رہے کہ لفظ "خدمت" بہت وسیع معانی رکھتا ہے۔ اِنسانیت کی فلاح و بہبود اور بہتری کیلئے جو بھی کام کیا جائے وہ خدمتِ خلق سے موسوم کیا جائے گا۔ خواہ وُہ کام عارضی طور پر نفع رساں ہو، یا مستقل۔ لیکن خدمت بہر حال ہوگی۔

۱۲ ار فروری ۱۸۰۹ء کو امریکہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک غریب بڑھئی کے گھر ایک بچّے نے جنم لیا۔ ایک سال تک معمولی جھونپڑی میں گذر کیا۔ والدہ بیمار ہوئی مگر بے سرو سامانی کی وجہ سے علاج معالجہ میسّر نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماں کی مامتا بھی ہمیشہ کیلئے رخصت ہوئی۔ بچے کو ایک قریبی سکول میں داخل کیا گیا۔ نہایت ناسازگار حالات میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۲۸ء میں گھر سے باہر جانے کا موقعہ ملا۔ جبکہ ہر طرف غلامی کا دور تھا۔ بیچارے حبشی غلام جانوروں کی طرح فروخت کئے جاتے اور ان پر ظلم و ستم ڈھانے میں ذرہ بھر بھی دریغ نہ کیا جاتا۔ اس حالت کو دیکھ کر اس نوجوان کے دِل میں اس مظلوم طبقہ کے لئے محبت نے جوش مارا اور عزم کر لیا کہ جب بھی مجھ سے ممکن ہوا غلامی کے اس دَور کو ختم کرونگا۔ اور اِن مظلوم و ستم رسیدہ غلاموں کو آزاد کرا کر دم لُونگا۔ یہی وہ عزم، بلند ارادہ اور جذبۂ خدمتِ خلق تھا جس نے اس معمولی اور غریب الوطن نوجوان کو آہستہ آہستہ سٹور مینجر اور سرویئر سے ترقّی دلا کر ضلعی کونسل کا ممبر بنا دیا۔ اسکے سامنے صرف

ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح غلامی کو مٹا دیا جائے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ :-

"یہ قوم آدھی آزاد اور آدھی غلام نہیں رہ سکتی"

خدمتِ انسانیت کے اسی جنون نے اُسے ۱۸۶۰ء میں امریکہ کے صدر کی حیثیت سے لا کھڑا کیا۔ اُس کے عزم کے پُورا ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء میں اُس نے ملک میں غلامی کے خلاف بل پاس کرایا۔ اور اس طرح دُنیا کی تاریخ میں مخدومِ انسانیت کی حیثیت سے ہمیشہ کیلئے اپنا نام باقی رکھا۔

جانتے ہو کہ یہ کون تھا؟ یہ امریکنوں کا محبوب و ہر دلعزیز صدر ابراہام لنکن تھا۔ جسے اس وقت امریکہ کے قومی ہیرو ہونے کا فخر حاصل ہے اور ہر امریکی کے دل میں اس کیلئے محبّت کے جذبات موجزن ہیں۔

افلاطون جسے آج حکمائے عالم کی صفِ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے، یونان کے ایک علمی خانوادہ سے تعلّق رکھتا تھا۔ ابتدائے زمانہ سے ہی تحصیل علم کا اس قدر جوش تھا کہ دن رات اُستادوں اور ہم مکتب ساتھیوں سے علمی مسائل پہ بحث کرتا اور کتب کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ مگر شاید وُہ اتنا بلند مقام نہ پاتا۔ اگر اُس کا علم صرف اُسی تک محدود رہتا اور نہ ہی وہ ارسطو جیسے شاگرد پیدا کر سکتا۔ اہل یونان تو یہانتک کہہ دیتے ہیں :-

"اس کی ولادت اللہ کے نُور سے ہوئی تھی اور اس کا ستارہ بہترین ستارہ تھا"

مگر جس چیز نے اُسے زبانِ زدِ خاص و عام کیا، وُہ دراصل یہی خدمت اور ہمدردیٔ خلق تھی۔ چنانچہ لکھا ہے :-

"حکیم ارباب سخا و تقویٰ میں ایک ممتاز مقام رکھتا تھا، دُوسروں کو بہترین سیاست کی تعلیم دیتا تھا، تو خود کیوں نہ عمل کرتا"

قبر پر لکھا ہے :-

"افلاطون کا جسم بے شک زمین میں مستور ہے لیکن اُسکی رُوح اُن بلندیوں پر پہنچ چکی ہے جہاں موت کی رسائی نہیں ہو سکتی"

بقراط علم طب کا مشہور امام اور علمائے طبیعیات کا رئیس سمجھا جاتا ہے۔ دمشق میں گھنے جنگلات میں تعلیم و عبادت کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ بڑا خدا پرست و زاہد انسان تھا۔ "لوگوں کا علاج مُفت کرتا اور دیہات میں پھر پھر کر مریضوں کو ڈھونڈتا تھا" کہتے ہیں کہ :-

"بقراط پہلا حکیم ہے جس نے اپنی اولاد کی طرح غرباء کو بھی فنِ طب کی تعلیم دی"

پس یہ بات مسلّم حقیقت ہے کہ "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد"۔ جو بھی انسانیت کی خدمت کرتا ہے بالآخر انسانیت اس کی خدمت کرنے میں فخر سمجھتی ہے ٭

گلہائے رنگا رنگ

- سعید انجم
- محمد یار
- منیر الحق شاہد
- صابر ذکی
- محمد انور قریشی
- صفدر علی
- نسیم احمد اقبال
- خلیل اللہ طاہر
- انیس احمد جاوید
- عطاء الکریم شاہد
- قریشی برکات احمد خالد
- منور احمد
- سید نعیم حیدر

سعید انجم
بی اے۔ سال دوم

افسانہ

زرد پتّے۔ سُرخ پھول

صبح صبح باپ کی گالیوں کے ساتھ اُس کا دن طلوع ہوُا۔ ناشتہ بڑے بھائی کے دو چار ہاتھوں نے کرا دیا۔ اور ٹھنڈے پانی کے دو چار چھینٹوں نے اُس کے مُنہ کو سنوار کر کالج جانے کے لئے تیار کر دیا۔ اور وہ اُسی پاجامے اور قمیص کے ساتھ جس کے ساتھ وُہ رات بستر پہ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ کالج روانہ ہونے لگا۔ تو اُس کی بہن نے اُسے کالی سیاہ چائے کا ایک کپ پکڑایا اور ساتھ ہی بڑبڑانے لگی:

"بھوکے پیٹ کالج جا کے خاک پڑھے گا بیچارہ۔ آٹا خریدنے کے لئے بھی گھر میں پیسے نہیں ہیں، لعنت ہے ایسی زندگی پر"۔۔۔ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اپنے فقرے میں مزید اضافہ کر دیا۔" پر کمبخت موت سے بھی تو ڈر لگتا ہے"۔۔۔ اور انور سمجھ گیا کہ روزانہ ملنے والے روٹی کے ایک ٹکڑے کا بھی آج ناغہ ہے مگر بہن کے چھوٹے سے پیار بھرے بول نے اُس کا خُون بڑھا دیا۔ اور ساتھ ہی آنکھیں دُھندلا گئیں، اور ناک پُونچھنے کے بہانے اُس نے آنکھوں پر بھی ہاتھ پھیر ہی لیا۔ اور چُپکے سے چائے کی چسکیاں کچھ اس طرح سے لینے لگا جیسے وہ کوئی نہایت اعلیٰ قسم کی مزیدار سی چیز ہو۔۔۔ بہن نے برتن اکٹھے کئے اور چھوٹے سے باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔

انور نے چائے ختم کی اور ہاتھوں کو رگڑتا ہوُا اُٹھ کھڑا ہوُا۔ پھر ایک انگڑائی لے کر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، باورچی خانے سے نکل کر کمرے میں سے کاپی اُٹھا کر گھر سے جانے لگا۔ تو اُس کی بہن نے اُسکے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" یہ لو میرے پاس ایک چونّی پڑی تھی۔ کچھ کھا پی لینا"۔ ساتھ ہی چونّی آگے بڑھا دی وہ شائد انکار ہی کر دیتا۔ مگر اُس کا دِل بھر آیا تھا اور گلا رُندھ گیا تھا، اس لئے وہ بول نہ سکا اور چونی پکڑ کر جلدی سے چل پڑا۔ گھر سے باہر نکل کر سر کو نیچے ڈال کر اُس کے ہلکے ہلکے قدم کالج کی جانب اُٹھنے لگے۔ کالج گیٹ میں سے گذرتے ہوئے اُس کا جی چاہا کہ وُہ جیب میں پڑی ہوئی چونّی کے سگریٹ خرید لے مگر یہ اُسے اپنی بہن کے ساتھ زیادتی محسوس ہوئی۔ اِس لئے وہ سر کو جھٹک کر کالج گیٹ میں داخل ہو گیا۔ کالج میں

سب سے پہلے فہیم ملا۔ پھر ادریس ملا اور انور اُن دونوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا لائبریری کی طرف چلنے لگا۔

"کوئی سگریٹ ہے تمہارے پاس؟" ادریس نے پُوچھا۔

"کوئی نہیں یار۔" انور نے جواب دیا۔

"اِس کے پاس کبھی ہوا بھی ہے"۔ فہیم نے ٹکڑا لگالیا۔

انور نے ادریس کے قہقہے کا ساتھ نہیں دیا بلکہ خاموشی سے چلتا رہا۔

لائبریری میں رش بے تحاشہ ہی تھا، اِس لئے وہ برآمدے ہی میں کھڑے ہوگئے۔ ابھی پہلا ہی پیریڈ تھا، اور انور کا تیسرا پیریڈ لگنا تھا۔

"اچھا سگریٹ نہیں تو کم از کم چائے تو پلادے آج کمبخت"۔ ادریس نے انور کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اِن تلوں میں تیل نہیں ہے بیٹا"۔ فہیم نے دُوسری مرتبہ انور پر چوٹ کی۔ مگر وہ چُپ ہی رہا۔

"کیوں غشی کیوں طاری ہونے لگی ہے تم پر۔ شکل دیکھنا ذرا اِس کی فہیم۔ لگے ہیں بارہ بجنے۔ چند ہی منٹ رہ گئے ہیں، ادریس نے فہیم کو کاندھے سے پکڑ کر کہا۔ پھر انور کا بازو پکڑ کر بولا۔

"آ، آ، آج بھی ہم ہی سے پی تُو چائے۔ تمہارا نہیں کراتے کچھ خرچ"۔ ساتھ ہی انور کو کھینچا۔

"نہیں یار۔ اِس وقت تو ذرا بھی دِل نہیں چاہ رہا۔ اور پھر ابھی گھر سے بھی تو چائے پی کے آیا ہوں" انور نے کہا۔

"اوئے انور تم اور انکار۔ بھئی کمال، حیرت انگیز"۔ فہیم نے پھر آوازہ کسا۔

"ہاں ہاں یار (Seriously) سچ کہتا ہوں بالکل موڈ نہیں ہے"۔ انور نے تقریباً بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

مگر ادریس اور فہیم اُسے زبردستی کھینچتے ہوئے ٹک شاپ لے ہی گئے۔ اور چائے آگئی۔ چائے "سُوکھی" نہ تھی۔ لوازمات ہمراہ تھے۔ جنہیں دیکھ کر انور کی بھوک چمک اُٹھی۔ مگر کیا مجال جو اُس کا ہاتھ اُدھر گیا ہو۔ بس چائے کی چسکیاں ہی اُس نے کافی سمجھیں۔ اور فہیم اور ادریس کے قہقہوں کا ساتھ دینے کی بجائے کسی نامعلوم سوچ میں ڈوبا رہا۔ یہانتک کہ اچانک فہیم بولا :-

"ارے تو چُپ ہے آج افسانہ نگار! کن سوچوں میں گُم ہو۔ ہنسو، کھیلو اور قہقہے لگاؤ یہی زندگی ہے"۔

انور پر کچھ اثر نہ ہوا۔ سوائے ایک پھیکی سی مُسکراہٹ کے جو خود بخود اُسکے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔ جس کے ساتھ ہی کچھ اور دوست بھی آگئے اور ہاتھ ملانے کے بعد اُسی ٹیبل کے گرد کُرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے چائے اور آگئی۔ باتوں کا موضوع بھی اور آگیا۔ مگر انور کی حالت وُہی رہی۔ وُہ کبھی سر کو کھجاتا اور کبھی

ٹھوڑی پہ ہاتھ چلاتا — کہ یہاں تک چپڑاسی کا ہاتھ چلا اور دُوسرا پیرڈ شروع ہو گیا۔
دُوسرا پیرڈ شروع ہُوا تو محفل ختم ہوئی۔ اور سوائے اِدریس اور انور کے سبھی کلاس روم کی طرف چلے گئے اور یہ ایک خالی پلاٹ میں چلے گئے۔ اور وہاں اِدریس نے پُوچھا۔
"کیوں میاں! تم پر کونسی بپتا ٹوٹ پڑی ہے جو یُوں مُنہ پُھلائے پھر رہے ہو کچھ تو پتہ چلے آخر"
اور انور نے بڑی دھیمی آواز میں صرف اِتنا ہی کہا۔ "کچھ نہیں یار"
"اچھا چھوڑو نہ بتاؤ تم "راز" کی باتیں۔ مگر تمہیں ایک کام کہا تھا" اِدریس نے کہا۔
"ہاں یار۔ مگر بڑا افسوس کہ مَیں اِتنا بھی نہ کر سکا وہ کتاب ہی کر دوں"۔ انور نے کہا۔
"کر دوں کیا۔ گھر میں سے اُٹھا کر مجھ تک نہیں پہنچا سکے"۔ اِدریس نے تیزی سے کہا۔
"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دراصل وہ میرے پاس تھی ہی نہیں کسی سے ہی لیکر دینی تھی"۔ انور نے کہا۔
"لو اب پاؤں ہی سے اُکھڑ گئے۔ تمہاری کہاں گئی؟" اِدریس نے پُوچھا۔
"میں نے خریدی ہی کہاں تھی"۔ انور نے کہا۔
"اچھا تو تم اتنے ہی (EXTRA ORDINARY GENIOUS) ہو۔ کہ بغیر کتاب کے اکنامکس کے پیپر میں پاس ہو گئے"۔ اِدریس نے عجیب انداز میں پُوچھا۔
"نہیں۔ میں کبھی کسی سے مانگ کر پڑھ لیتا کبھی کسی سے"۔ انور نے دکھی سے لہجے میں کہا۔
"مَیں بھلا پُوچھ سکتا ہوں صاحب کہ ایسا کیوں تھا۔ اِدریس نے ذرا آنکھ ٹیڑھی کر کے کہا۔
"یار دراصل اپنے گھر کی حالت ہی ایسی نہیں کہ ۱۲ روپے کی کتاب خرید سکوں"۔ انور نے دبے لہجے میں کہا۔
"ہیں ہیں۔ پھر کہنا ذرا" اِدریس نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ہاں ہاں میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں بھئی۔ مَیں ایک غریب گھرانے کا غریب لڑکا ہوں۔ میں ایک ہی جوڑا اِسلئے نہیں پہنتا کہ میں لاپرواہ ہوں۔ بلکہ اِسلئے کہ دوسرا میرے پاس ہے ہی نہیں"۔ انور نے تیزی سے ڈھڑکتے دِل کے ساتھ کہا۔ "اور آج سے پہلے میں نے جتنی بھی باتیں اپنے اور اپنے خاندان کے متعلق سُنائی تھیں اُن میں اکثر جھوٹ تھیں۔ صرف گپیں تھیں"۔
انور لگاتار بولتا رہا۔ اِدریس سُنتا رہا اور اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ چُپ ہُوا تو اُس کا پُرسکون چہرہ اُس کے مطمئن دِل کا پتہ دے رہا تھا۔ مگر اِدریس کی پریشانی بجا تھی۔

"وہ لاہور والی شمیم۔ نادرہ اور حمیدہ والی تمام باتیں جھوٹ تھیں؟" ادریس نے حیرانگی سے پوچھا۔
"بالکل جھوٹ" انور نے جواب دیا۔
"اور تمہارے ماموں کمشنر بھی نہیں؟" ادریس نے دوسرا سوال پوچھا۔
"ناں" انور نے پھر جواب دیا۔
ادریس کچھ دیر انور کو عجیب نظروں سے گھورتا رہا اور پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھتے ہوئے بولا:
"میں تمہیں اتنا ذلیل اور کمینہ شخص نہیں سمجھتا تھا۔ مگر تم نے ـــــ اپنے آپ کو نہایت گھٹیا آدمی ثابت کیا ہے۔" پھر وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انور کی طرف پشت کر کے بولا۔ "اور میری دونوں پتلونیں آج ہی میرے پاس پہنچ جائیں"۔ اتنا کہہ کر تیزی سے چلا گیا اور انور سوچنے لگا کہ نہ معلوم کیوں وہ ان ۲۰ روپوں کو بھول گیا جو اس نے اس سے ادھار لئے تھے۔
کچھ دیر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر کالج گیٹ سے باہر نکل گیا۔ مگر سگریٹ لے کے دوبارہ آگیا۔ اور ٹکشاپ کی پچھلی جانب کے پلاٹ میں بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ تیسرا پیریڈ شروع ہو چکا تھا مگر وہ کلاس میں نہیں گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ وظیفہ حاصل نہ کرتا، تو کالج میں کبھی نہ پڑھ رہا ہوتا۔
"ہیلو انور" کچھ دیر کے بعد کریم نے آکر کہا۔
انور نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک مسکراہٹ اسکے چہرے پر پھیلی، اور کریم وہاں گھاس پر بیٹھ گیا۔
"تم کلاس میں نہیں آئے؟" کریم نے پوچھا:
"موڈ ہی نہ بن سکا یار" انور نے کہا:
"اللہ ہی رحم کرے تمہارے موڈ پر" کریم نے دعا کی۔
انور خاموش ہی رہا۔ وہ کش لگاتے ہوئے ایک تنکے سے زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔
کریم اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا اور پھر بولا:
"تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ سگریٹ انسانوں کی طرح پیا کرو۔ تم سگریٹ پیتے نہیں بلکہ کھاتے ہو۔ کچھ دھواں تو باہر نکالا کرو۔" کریم نے لیکچر جھاڑ دیا۔
"ڈیئر! تم نہیں سمجھتے اس بات کو" انور نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔
"بس آہ بھر کے کہہ دیا کرو تم نہیں سمجھتے۔ تم بھلا کیا سمجھتے ہو" کریم نے چڑ کر کہا۔
"میں ڈارلنگ یہ سمجھتا ہوں کہ انسان بھی تو ایک سگریٹ ہے جسے ماں باپ نے ماچس کی تیلی اور ڈبیہ بن کر سلگایا۔ اور جب ہولے ہولے سلگ کر یہ ختم ہو جائے گا، تو لوگ کہیں گے مر گیا بیچارہ"

انور نے تقریر کر ڈالی - اور کریم نے بڑی زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا :
"آ گئی نا افسانہ نگاری والی بات - ہر جگہ افسانہ نگاری ہی بکھیرا کرو"۔
"جب میں مر جاؤں گا نا تو تم لوگوں سے یہی کہو گے کہ وہ پیدائشی افسانہ نگار تھا، اُس کی ہر بات سے افسانہ نگاری جھلکتی تھی"۔
کریم نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "اچھا چھوڑو اِسے اور یہ بتاؤ وُہ "بارات" کا جواب آیا ؟"
"کوئی نہیں"۔ انور نے جواب دیا۔
"اور وہ جنہیں "ساکن ہاتھ" بھیجا اُن کے پیسے آئے"۔ کریم نے پھر پُوچھا۔
"نہیں"۔ انور نے جواب دیا۔
"اچھا تو وُہ تم نے افسانے کسی پبلشر کو دکھائے ہیں"۔ کریم نے مزید استفسار کیا۔
"نہیں یار - آج ہی جاؤں گا"۔ انور نے بتایا۔
"کریم صاحب !" کسی نے پُکارا۔ "ذرا ایک بات کرنی ہے تشریف لائیے گا"۔
"ابھی آتا ہوں بھئی" کہہ کے کریم اُدھر چلا گیا۔
انور سر کو پکڑے کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر کاپی اُٹھا کر گھر کو چل پڑا۔ گھر میں صرف بہن ہی تھی۔
"کیا بات ہے آج اِتنی جلدی آ گئے"۔ اُس نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ کچھ کاغذات تھے۔ پروفیسر نے مانگے ہیں، وُہ لینے آیا ہوں"۔
اُس نے ایک الماری کھولی، کتابوں کے پیچھے سے ایک فائل نکالی اور اُس میں سے ایک لفافہ اُٹھایا، جس میں اُس کے اچھے اچھے پندرہ افسانے تھے۔ اور گھر سے نکل گیا — اب اُس کا رُخ ایک پبلشر کیطرف تھا۔
وہاں دو چار آدمی بیٹھے ہوئے دیکھکر اُس نے کہا۔ "مَیں ملک نذیر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"۔
"فرمائیے"۔ ایک آدمی اُن میں سے بول پڑا"۔
انور نے ہاتھ ملایا اور پھر کہا۔ "میرا نام انور علی ہے مَیں گورنمنٹ کالج میں آخری سال کا طالب علم ہوں۔ کالج میگزین میں میرے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں اور ملک کے بعض دُوسرے ادبی رسائل میں بھی میرے کچھ افسانے شائع ہوئے ہیں اور اب مَیں اپنا مجموعہ شائع کرانا چاہتا ہوں، دراصل مجھے کچھ پیسوں کی بھی ضرورت ہے"۔
انور بے تکی سے بات مکمل کر ہی گیا۔
"اچھا اچھا۔ افسانے لائے ہیں آپ ؟" ملک نذیر نے پُوچھا۔
"جی ہاں"۔ انور نے کہا اور میز پہ لفافہ رکھ دیا۔

"انہیں یہاں رکھ جائیے اور کل آ کے پتہ کیجئے۔ افسانے پڑھ کر ہی بات ہوگی۔ پبلشر نے کہا۔
"ضرور کل ہی۔ آج نہیں ہو سکتا؟" انور نے پوچھا۔
"مشکل ہے۔" اس نے کہا۔
"جی دراصل بات یہ ہے کہ میں نے کل فیس داخلہ ادا کرنی ہے۔" انور نے بمشکل جھوٹ بولا۔
"اچھا" اس نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ آپ آئیے گا۔ کچھ کریں گے۔"
انور نے شکریہ ادا کیا اور ہاتھ ملا کر کالج چلا گیا۔
پریکٹیکل کے بعد جب وہ گھر پہنچا، تو اس کا باپ گھر میں تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی بولا۔
"آؤ آؤ بیٹا آ گئے کالج سے۔ صبح تم نے خواہ مخواہ مار کھائی۔ غصہ تھا پیسوں پر، اور نکالا تمہارے اوپر۔" اور پھر پچکارتے ہوئے پوچھا۔ "صبح سے کچھ نہیں نا کھایا پیا۔"
"ایک دوست کے ساتھ چائے پی تھی۔" انور نے بتایا۔
"اچھا اچھا پھر تو تمہیں بھی خوب بھوک لگی ہوگی یہ لو روپیہ بس یہی ملا ہے دو کر آٹا لے آؤ۔" اس کے باپ نے کہا۔ انور نے کاندھے پر کپڑا رکھا اور گھر سے نکل کر پبلشر کی طرف چل پڑا۔ اس نے سوچا کہ "وہ افسانے پڑھ چکا ہوگا، اسے پسند بھی آئے ہونگے بس اب دو چار سو روپیہ مل جائے گا۔ وہ اکڑ گیا۔ اور خوشی سے قدم لڑکھڑا گئے۔ "اتنے پیسے دیکھ کر میرا باپ کتنا خوش ہوگا۔" اس نے سوچا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پبلشر کے پاس پہنچ گیا۔
"آئیے آئیے انور صاحب۔" پبلشر نے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ ان سے ملو۔ سیٹھ قادر صاحب شہر کی نامور ہستی ہیں۔" پھر اس سیٹھ سے انور کا تعارف کرایا اور انور سیٹھ سے مصافحہ کر کے پاس رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔
"ہاں تو انور صاحب پڑھ لئے ہیں آپ کے افسانے۔" پبلشر نے سر کو کرسی کی پشت پر لٹکاتے ہوئے کہا۔
"پھر کیسے لگے آپ کو" انور نے فوراً سوال کر دیا۔
"افسانے اچھے تو ہیں مگر کچھ دشواریاں ہیں مجموعہ کی اشاعت کے سلسلہ میں" پبلشر نے رک رک کر کہا۔
"ایک تو آپ کا نام اتنا جانا پہچانا نہیں۔ دوسرے شاید ہی نفع ہو بلکہ ممکن ہے نقصان ہی ہو جائے۔
"پھر" انور نے بجھے دل کے ساتھ کہا۔
"پھر بس ہم تو آپ کو صرف ۳۰ یا ۴۰ روپے ہی دے سکتے ہیں۔ نہیں تو پھر آدھا آپ خرچ کریں آدھا ہم۔ اور نفع نقصان بھی آدھا آدھا۔" ملک نذیر نے بات مکمل کر دی۔ اور ملک نذیر کے چہرے پہ

پھیلی ہوئی مُسکراہٹ کے ساتھ انور کے بجھتے دِل کا اثر اُسکے چہرے پر ظاہر رنگ سے بھی ہوا۔ دونوں ہاتھوں کو ملتے ہُوئے اُسے یُوں محسوس ہوا جیسے ہوائی جہاز میں سے بغیر چھتری کے کُود پڑا ہو۔ بلکہ پھینک دیا گیا ہو۔

"کیا خیال ہے پھر آپ کا" ملک نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"جی" انور جیسے کنوئیں میں سے بولا۔

"آپ پھر راضی ہیں ۳۰۰ روپیوں پر" پبلشر نے داڑھی کھجلاتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ نہیں" انور جیسے ایک دم ہوش میں آگیا ہو" آپ براہ کرم میرے افسانے واپس کر دیں"۔ پبلشر نے پلندہ میز پر رکھ دیا۔ اور انور چیل کی طرح اُس پر جھپٹا اور خرگوش کی طرح دُکان سے باہر نکل گیا۔ دھڑکتے دِل اور سُرخ رنگ کے ساتھ اُس نے ہاتھوں کو زور سے دبایا، تو کندھے پر رکھا ہُوا کپڑا نیچے گر پڑا۔ اور اُسے آٹا یاد آیا۔

"انور صاحب" اچانک پیچھے سے آواز آئی۔

انور نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُسے سیٹھ قادر نظر آیا۔ جو کہہ رہا تھا" بات سُنو"

انور اُس کی طرف بڑھ گیا۔" فرمائیے" لہجہ ملائم تھا۔

"تم نے کل فیس داخلہ ادا کرنی ہے" اُس نے پُوچھا۔

"جی ہاں" دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اور سوچا کہ شائد پبلشر نے بتایا ہو گا۔

"ایک صورت ممکن ہو سکتی ہے" سیٹھ نے آنکھیں پھیلانے کے ساتھ اُنگلی اُٹھاتے ہوئے کہا۔

انور کو اندھیرے میں ایک کرن دکھائی دی اور وُہ جلدی سے بولا" فرمائیے"۔

"ہوں" سیٹھ نے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا" مَیں تمہارے افسانوں کو شائع کرواؤں گا۔ سارا خرچ میرے ذمہ ہو گا، اور تمہیں بھی ڈیڑھ سو روپیہ دے سکتا ہوں" سیٹھ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں آپ کا بہت شُکر گذار ہوں گا جناب" انور نے جلدی سے کہا۔"آپ بہت بڑے آدمی ہیں"۔

"ایک شرط ہے" سیٹھ کی آنکھوں میں عیارانہ چمک دکھائی دی۔

انور کا دل بڑی شدّت سے دھڑکا، اور ایک لمحہ کے لئے تو اُسے سیٹھ سے ڈر بھی لگا۔

"وہ شرط یہ ہے ——" سیٹھ پھر چُپ ہو گیا اور انور کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں بتائیے۔ فرمائیے گا" انور نے بے تابی سے کہا۔

"تم بس" سیٹھ نے مُسکراتے ہوئے انور کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے۔" مجھے صرف یہ

لکھ دو کہ میں اِس بات کا گواہ ہوں کہ ـــــ" بات پھر اُدھوری چھوڑ دی گئی۔
"ہاں ہاں کہیئے گا۔ رُک کیوں گئے آپ" انور نے بڑی شدّت سے دھڑکتے دِل پر بمشکل قابو پاکر کہا۔
"کہ یہ افسانے" ـــ سیٹھ ایک لمحہ کیلئے رُکا۔ انور کی نظریں اُسکے چہرے پر تھیں "سیٹھ قادر بخش نے لکھے ہیں"۔ "یعنی" انور کو یُوں محسوس ہُوا جیسے بم گرا ہو۔
"افسانے میرے نام سے چھپیں گے"۔ سیٹھ نے عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "بولو منظور ہے"۔
انور چُپ رہا تو سیٹھ نے کہا۔ "اچھا ڈیڑھ سو دُوں گا"۔ اور پرس جیب سے نکالا۔
کچھ دیر کے بعد انور اپنے باپ کے پاس کھڑا اُس کا ایک روپیہ واپس کرنے کے علاوہ اپنی پھُولی ہوئی جیب کو بھی خالی کر رہا تھا۔

شعروں کے انتخاب نے ......

وہ عیادت کے لئے آئے ہیں لو اور سہی
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے
(داغ)

پھولوں کی مہک کم نہیں کانٹوں کی چبھن سے
کِس کِس سے کوئی دامن احساس بچائے
(ثاقب زیدی)

محبّت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
(اقبال)

زندگی بھی کس مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے رہتے ہیں
(ساحر)

کتنے ہاتھوں نے بُنے اطلس و کمخواب مگر
میرے ملبوس کی تقدیر میں پیوند رہے
(ساحر)

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے
(حفیظ جالندھری)

محمد یار
بی ایس سی سال دوم

غُبار دیکھتے رہے

سورج غروب ہونے کو تھا۔ برآمدے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی بوڑھی صُغریٰ نے ثریّا کو آواز دی۔ بیٹی نیچے آؤ۔ سُورج غروب ہو رہا ہے۔ کچھ کھانے کے لئے ہی پکا لو۔"

صغریٰ نے آواز تو دے دی لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کا دِل غم کے بے کنار سمندر میں غوطے لینے لگا اور اُس کی آنکھیں اشکوں سے تر ہوگئیں۔

مغموم ثریّا نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔" اچھا امّاں آرہی ہوں"۔

ثریا صغریٰ کی چارپائی کے پاس آکر رُکی اور پھر غم سے مغلوب ہو کر کمرے کے اندر پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئی۔ وُہ آج دو دِن کی بھُوکی تھی۔

ثریا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔" ماں! کیا آپ کو بھوک لگی ہے"۔

" نہیں بیٹی! تیرے لئے کہہ رہی ہوں"۔ صغریٰ نے جواب دیا۔

صُغریٰ کو بھوک کیسے لگتی۔ جمیل جو اس کے شوہر کی پہلی اور آخری نشانی تھا، چھن چکا تھا۔ وُہ بمشکل دو ماہ کا ہوگا کہ اس کا والد چند دِن کے بخار کے بعد اس دُنیائے فانی سے رخصت ہوگیا۔ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا جو صغریٰ اور جمیل کی کفالت کرتا۔ جوان صُغریٰ تکلیفوں کا گہوارہ اور دُکھوں کا نشانہ بن کر رہ گئی۔ جواں ہمّت صغریٰ نے محنت مزدوری کر کے خود پیٹ پر پتھر باندھ کر جمیل کی پرورش کی تھی اور اُسے تعلیم دلائی تھی۔ اب جمیل ملازم ہوگیا تھا اور اُسکی ملازمت کو ابھی ایک ہی سال گذرا تھا۔

جمیل کے ملازم ہو جانے کے بعد بوڑھی صُغریٰ پھر سے جوان نظر آرہی تھی۔ اسکی آنکھیں ستاروں کی مانند روشن اور دِل چاند کی طرح ضوفشاں تھا۔ اس کی خمدار کمر سیدھی ہوگئی تھی۔ اور وہ اپنی گذشتہ تکلیفوں کو یکسر بھُول چکی تھی۔ وُہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھ رہی تھی۔ اِسی لئے اُس نے جمیل کے لئے اپنے ایک دُور کے رشتہ دار شریف کی بیٹی ثریا کا رشتہ طے کرلیا۔

وہ اپنے جمیل کو بیاہنے شریف کے گھر گئی۔ اُس نے دیکھا کہ" شریف جمیل سے بہت خوش ہے۔

ثریّا کی والدہ مارے خوشی کے جمیل کی بلائیں لے رہی ہے۔" ثریّا کو گھر میں لاکر اُس نے دِلی سکون و اطمینان محسوس کیا تھا۔ آخر سکون و اطمینان کیوں نہ محسوس کرتی۔ کتنے سالوں کے بعد وہ گھر میں چہل پہل اور رونق دیکھ رہی تھی۔ اُس کے دِل میں نہ جانے کون کون سی اُمنگیں موجزن تھیں۔

ثریا صغریٰ سے بھی زیادہ خوش تھی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ اُسے ایسا شوہر ملا تھا، جو اُسے چاہا کرتا تھا۔ اُسے کوئی کمی نہ تھی۔

جمیل ہنس مُکھ اور فراخ دِل آدمی تھا۔ جسمانی طور پر بھی وُہ خوبصورت اور بھلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ساڑھے تین سو روپے کا ملازم تھا۔ سارا کنبہ خوش و خرم تھا۔ لیکن قدرت کو اُن کی یہ خوشی پسند نہ آئی۔ اور یہ خوشی کا سرچشمہ، سکون کا موجب اور آرام کا بانی اُن سے چھن گیا۔

جمیل صبح اپنی پیاری رفیقۂ حیات اور محترمہ والدہ کو سلام کرکے دفتر روانہ ہُوا تو کہہ گیا۔ "اماں! مَیں آج معمول سے پہلے واپس آجاؤں گا۔ کیونکہ ثریا کو میکے چھوڑنے جانا ہے۔"

ثریّا نے بھی آج معمول سے پہلے کھانا تیار کیا اور انتظار کرنے لگی اور سوچنے لگی کہ میرا . . . . جمیل ابھی آتا ہوگا۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ "بیٹی دروازہ کھولو۔ جمیل آئے ہیں۔" صُغریٰ نے باورچی خانے میں بیٹھی ثریا کو آواز دی۔

ثریا باورچی خانے سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ وُہ سوچ رہی تھی کہ میرے . . . . . جمیل آئے ہیں . . . . .

صُغریٰ اور ثریا کے رونے کی آواز سُن کر ہمسایہ عورتیں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ اُن کی یہ ناگفتہ بہ حالت دیکھکر ہر ایک بے اختیار چیخ اُٹھتی اور پُوچھتی "کیا ہُوا"۔ کون بتا سکتا تھا۔ "کیا ہُوا"۔ صغریٰ اور ثریا کی زبانیں، "کیا ہُوا" بتانے سے پہلے گنگ ہوگئی تھیں۔

اُن کی زندگیوں کا سہارا، اُن کی خوابوں کی تعبیر، اُن کی منزلِ مقصود . . . . جمیل صبح دفتر پہنچنے سے پہلے ایک حادثہ کا شکار ہوچکا تھا۔ اور یہ اطلاع اُنہیں بنک کے ایک ملازم نے دی تھی۔

اسی مصیبت میں صُغریٰ اور ثریا کے دو دِن گزر چکے تھے۔ اُن کے حلق کھانے اور پینے سے معذور ہوچکے تھے۔ اُن کے گلے رونے کی وجہ سے بیٹھ گئے تھے۔ آنکھیں سُوج گئی تھیں۔

"کچھ نہ کچھ ضرور پکالو۔ آخر کب تک بھوکی رہوگی بیٹی!" صُغریٰ نے پھر کہا۔

"تمہاری زندگی میں تو نئی بہار آسکتی ہے اور تم ......"
صغریٰ کی آواز رندھ گئی اور وہ فقرہ پورا نہ کر سکی۔
صغریٰ نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں اب کسی کی نہیں رہی۔ میں اب بہار کی امید سے کنارہ کش ہو چکی ہوں۔ ...... میں بدنصیب شروع زندگی ہی سے نحوست ......"
ثریا بچوں کی طرح بلبلا اٹھی اور اس کے رونے کی آواز صغریٰ کی آواز پر غالب آگئی۔ صغریٰ چارپائی سے اٹھی اور ثریا کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔
"میری بیٹی میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔ صبر کرو۔"
ثریا کی ہچکی بندھ گئی اور صغریٰ نے اس کا سر گود میں رکھ لیا اور کہا۔ "بیٹی چپ ہو جاؤ۔"
ثریا نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

حاصلِ مطالعہ

- امیروں کا یہ خیال کہ "غریب" مسرت اور شادمانی کی دولت سے مالا مال ہیں، اتنا ہی احمقانہ ہے جتنا غریبوں کا یہ یقین کہ "امیر" خوش ہیں۔ (باسٹن پوسٹ)
- اپنے گناہوں پر پچھتانا اتنا تکلیف دہ نہیں ہے۔ جتنا گناہوں کا خمیازہ بھگتنے کا خوف۔ (روچیفاؤ کالٹ)
- جب ہم کسی تمنا کا گلا گھونٹتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم مضبوط اور طاقتور ہیں۔ اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ تمنا کمزور ہوتی ہے۔ (روچیفاؤ کالٹ)
- اگر چاہتے ہو کہ تمہاری دعا قبول ہو تو حرام کی کمائی کے ایک لقمے سے بھی پرہیز کرو۔ (امام غزالی)
- نیک آدمی وہ ہے جو خود کو "بد" سے الگ نہیں سمجھتا۔ (خلیل جبران)
- نیک نامی عورت اور مرد کی روحوں میں بسی ہوئی نکہت اور زیورِ انسانیت ہے۔ جو شخص میری زر کی تھیلی چراتا ہے۔ وہ مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچاتا کیونکہ یہ دولت تھوڑی دیر پہلے میری تھی اب اس کی ہے۔ اسی طرح ہزاروں ہاتھوں میں جا سکتی ہے لیکن جو میری نیک نامی کو مجروح کرتا اور چراتا ہے وہ اس سے خود تو امیر کبیر نہیں بنتا لیکن مجھے ضرور قلاش کر دیتا ہے۔ (شیکسپیئر)

(مرسلہ: نثار احمد بسرا۔ سال دوم)

"تمہاری زندگی میں تو نئی بہار آسکتی ہے اور تم ......"
صُغریٰ کی آواز رندھ گئی اور وہ فقرہ پُورا نہ کرسکی۔
صُغریٰ نے پھر کہنا شروع کیا۔ "مَیں اب کسی کی نہیں رہی۔ مَیں اب بہار کی اُمید سے کنارہ کش ہو چکی ہوں۔ ...... مَیں بدنصیب شروع زندگی ہی سے خوشی ......"
ثریا بچوں کی طرح بلبلا اُٹھی اور اُس کے رونے کی آواز صُغریٰ کی آواز پر غالب آگئی۔ صُغریٰ چارپائی سے اُٹھی اور ثریا کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔
"میری بیٹی مَیں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔ صبر کرو۔"
ثریا کی ہچکی بندھ گئی اور صُغریٰ نے اُس کا سر گود میں رکھ لیا اور کہا۔ "بیٹی چُپ ہو جاؤ۔"
ثریا نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

حاصلِ مطالعہ

- امیروں کا یہ خیال کہ "غریب" مسرت اور شادمانی کی دولت سے مالامال ہیں، اتنا ہی احمقانہ ہے جتنا غریبوں کا یہ یقین کہ "امیر" خوش ہیں۔ (باسٹن پوسٹ)
- اپنے گناہوں پر پچھتانا اتنا تکلیف دہ نہیں ہے۔ جتنا گناہوں کا خمیازہ بھگتنے کا خوف۔ (روچیفاؤ کالٹ)
- جب ہم کسی تمنا کا گلا گھونٹتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم مضبوط اور طاقتور ہیں۔ اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ تمنا کمزور ہوتی ہے۔ (روچیفاؤ کالٹ)
- اگر چاہتے ہو کہ تمہاری دعا قبول ہو تو حرام کی کمائی کے ایک لقمے سے بھی پرہیز کرو۔ (امام غزالی)
- نیک آدمی وہ ہے جو خود کو "بد" سے الگ نہیں سمجھتا۔ (خلیل جبران)
- نیک نامی عورت اور مرد کی روحوں میں بسی ہوئی نکہت اور زیورِ انسانیت ہے۔ جو شخص میری اشرفیوں کی تھیلی چراتا ہے۔ وہ مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچاتا۔ کیونکہ یہ دولت تھوڑی دیر پہلے میری تھی اب اس کی ہے۔ اسی طرح ہزاروں ہاتھوں میں جائے گی۔ لیکن جو میری نیک نامی کو مجروح کرتا اور چراتا ہے وہ اس سے خود تو امیر کبیر نہیں بنتا لیکن مجھے ضرور قلاش کر دیتا ہے۔ (شیکسپیر)

(مرسلہ: نثار احمد بسرا۔ سال دوم)

استدراک

المنار کے پچھلے شمارہ (۲/۱۴) میں راقم کے مضمون "ہمارا قومی ادارہ — تعلیم الاسلام کالج ربوہ" کی دوسری قسط شائع ہوئی تھی۔ اس میں جہاں کاتب صاحب کی مہربانی شاملِ حال رہی۔ وہاں مضمون لکھتے وقت خود مجھ سے کچھ اہم باتیں درج ہونے سے رہ گئیں جن کی طرف بعد میں بعض معزز اساتذہ نے توجہ دلائی جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

ایک بات کی وضاحت، جس کی ضرورت کا احساس مجھے بعض اساتذہ اور کچھ دوستوں کے اس مضمون پر تبصرہ کے بعد ہوا، کر دینا ضروری ہے۔ جب میں یہ مضمون لکھ رہا تھا تو میرے ذہن میں یہ بات ہرگز نہ تھی کہ یہ ایک مفصّل کتاب ہے جس میں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا آنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے میں نے صرف اہم باتوں کو ہی لیا۔ جن کا اثر نسبتاً زیادہ دیرپا ہے اور وہ ایک مدت تک کالج کے لئے باعثِ فخر رہیں گی۔ اپنے نزدیک غیر اہم باتوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ کھیلوں کے بیان میں بھی میں نے صرف انہی (GAMES) کا خصوصی طور پہ ذکر کیا ہے جن میں ہمارا کالج مسلسل کئی سال تک نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کرتا رہا ہے۔ اسی طرح کالج کے کھلاڑیوں کی انفرادی کامیابیوں کا ذکر بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔

ذیل میں ان اغلاط کی تصحیح کے ساتھ ساتھ بعض امور کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

صفحہ ۱۲ پر حاشیہ کی پہلی سطر میں لکھا ہے:۔ "اس سال کالج کے ایک طالب علم مرزا بشارت احمد بی اے کے امتحان میں مجموعی طور پہ یونیورسٹی میں تیسرے درجہ پر آئے"۔ یہاں بی اے کی بجائے بی ایس سی کے الفاظ پڑھے جائیں۔ اور ان الفاظ کا اضافہ کیا جائے:۔ "نیز فزکس میں اوّل رہے"

۱۹۵۳ء میں حمید اللہ بی ایس سی کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں دوم رہے۔ (کالج رپورٹ ۵۳-۱۹۵۴ء)

۱۹۵۵ء میں منور احمد سعید ایف اے میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہے۔

۱۹۵۷ء میں افتخار احمد شہاب بی اے کے امتحان میں انگریزی کے مضمون میں یونیورسٹی میں اوّل رہے۔

اسی صفحہ پر آخری سطر دیکھئے:۔ "اس سال" کی بجائے "۱۹۶۵ء" پڑھا جائے۔

صفحہ ۱۳ پر حاشیہ میں پانچویں سطر کا پہلا لفظ "امسال" نہیں "۱۹۶۱ء" پڑھا جائے۔ اسی سطر میں "اس سال" کو "۱۹۶۲ء" میں تبدیل کر لیا جائے۔ اگلی سطر میں لفظ "تاریخ" حذف سمجھا جائے۔ سطر ۸ اس طرح پڑھی جائے:

"فضل الرحمٰن نے بی اے کے امتحان منعقدہ ۱۹۶۲ء میں ریاضی میں یونیورسٹی بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کی"۔ تیرھویں سطر

میں "ہسٹری" کے الفاظ اُڑا دیئے جائیں۔ آخری سطر میں "۶۴ء میں" کے بعد "ایم اے عربی کے فائینل" میں کے محذوف ..... کا اضافہ کرلیا جائے۔

ص۱۵ سطر ۵ میں مکرم محمد مقبول الٰہی صاحب ایم اے سے قبل غلام علی صاحب چودھری کا نام درج کرلیا جائے۔

کالج یونین کے سٹوڈنٹ پریذیڈینٹس کی لسٹ میں یہ تبدیلیاں کرلی جائیں:۔

۴۸-۴۹ء: رانا محمد خان۔

۴۹-۵۰ء: میں منتخب صدر محمد اشرف چودھری تھے لیکن اُن کے کالج چھوڑنے کی وجہ سے حسام الدین کو نامزد کیا گیا۔ حسام الدین سے قبل شیخ کی بجائے میاں پڑھا جائے۔

۵۱-۵۲ء: میں منتخب صدر محمد نصراللہ۔ بعد میں آپ کی جگہ سید ناصر احمد شاہ (جن کا نام غلطی سے سید نصیر احمد شاہ چھپ گیا ہے) کو اس عہدہ پر مقرر کیا گیا۔

۵۵-۵۶ء کے آگے عطاء الکریم شاہد کا نام چھپ گیا ہے۔ آپ ۵۶-۵۷ء کے دوران صدر ہے۔ ۵۵-۵۶ء میں سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ سعید رحمانی تھے۔

۶۱-۶۲ء میں منتخب صدر مامون احمد تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے بیروت چلے گئے تو فضل احمد کو انکی جگہ نامزد کیا گیا۔

۶۳-۶۴ء کے آگے محمد کریم قمر کا نام چھپ گیا ہے۔ اس جگہ عبدالرشید شریف کا نام پڑھا جائے۔

۶۴-۶۵ء میں نامزد صدر محمد کریم تھے۔ ۶۵ء کے شروع میں موجودہ نیا الیکشن کروایا گیا جس میں عطاء المجیب راشد کامیاب قرار پائے اور انہوں نے ہی سال کے دوران سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ کے فرائض سرانجام دیئے۔

ص۱۶ پر چوتھے پیرے کو ذیل کے عنوان کے تحت سمجھا جائے "دیگر مجالس"

ص۱۷ پر حصہ اُردو کے نگران اساتذہ کی لسٹ میں مکرم فیض الرحمٰن صاحب فیضیؔ کے بعد مکرم پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب ایم اے کے نام کا اضافہ کرلیا جائے۔

ص۲۳ پر کالج کے متعلق جناب میاں افضل حسین کی رائے کا حوالہ درج ہونے سے رہ گیا ہے وہ یہ ہے: الفضل ۲۱ جون ۵۵ء

(داؤد طاہر)

تف ہے تاریخ پر عدمؔ جس نے
صرف شاہوں کے نام اُچھالے ہیں

(عدمؔ)

منیر الحق شاہد
بی اے۔ سال اوّل

ایک محفلِ شعر و سخن

(مشاعرے تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن یہ مشاعرہ جس کی روداد پیش خدمت ہے۔ ایک خاص شان کا حامل تھا۔ اسلئے ہم اسے ایک دلچسپ اور کامیاب محفلِ مشاعرہ قرار دے سکتے ہیں۔ شاہد)

"مورخہ چھ فروری بروز ہفتہ بزم اُردو تعلیم الاسلام کالج کے زیر اہتمام ایک محفلِ مشاعرہ انعقاد پذیر ہوگی جس میں ملک کے مشہور و معروف شعراء کرام حصّہ لیں گے۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے،

بس کچھ اسی قسم کا نوٹس معتمدِ بزم اردو کی طرف سے مشاعرہ سے چند روز پیشتر نوٹس بورڈ پر نظر آیا۔ پھر کیا تھا بڑی شدّت سے مشاعرہ کا انتظار کیا جانے لگا۔ اور پھر ع

آگیا آخر خدا کے فضل سے، دن گنا کرتے تھے جس دن کیلئے

آغازِ مشاعرہ کے لئے ساڑھے چھ بجے کا وقت مقرر تھا۔ بر وقت ہال میں پہنچنے کی کوشش کی لیکن اسوقت تک مشاعرہ کے شروع ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہال میں بیٹھے طلباء اور سامعین کا ہلکا ہلکا شور چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ سامعین و طلباء کا اضطراب بھی بڑھ رہا تھا لیکن میں اسی خیال سے خوش تھا کہ انتظار کی گھڑیاں تو وقت کے بڑھنے کے ساتھ ہی کم ہونگی نا۔ وقت پر مشاعرہ شروع ہو جاتا تو روایت کی پابندی کس طرح ہوتی۔ اور اب جبکہ وقت سات بجے کے قریب ہو چکا تھا۔ شعراء کرام ہال کے بڑے گیٹ سے داخل ہوئے۔ اور یوں سامعین کی جان میں جان آئی۔

بزمِ اُردو کے صدر جناب سید شمشاد علی نے مسندِ صدارت سنبھال لی۔ ابھی آغازِ مشاعرہ کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ مکرّم پرنسپل صاحب سٹیج پر تشریف لے آئے اور اعلان فرمایا کہ آج کے اس مشاعرہ میں ہم نے شعراء کرام سے ان کا پرانا کلام نہیں سننا بلکہ وہ اپنا نیا کلام ہمیں سنائیں۔ سامعین نے اس اعلان کو بہت سراہا اور شعراء کرام کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تلاوتِ کلامِ پاک اور رودادِ اجلاسِ گذشتہ کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ داؤد احمد ناصر نے حضرت مسیح پاک علیہ السلام کا فارسی کلام نہایت خوش الحانی سے سنایا ؎

عجب نوریست در جانِ محمدؐ　　عجب لعلیست در کانِ محمدؐ
اگر خواہی دلیلے عاشقش باش　　محمدؐ ہست بُرہانِ محمدؐ

دورانِ نعت ہر طرف محویت کا عالم طاری رہا اور مہمان شعراء اس کلام سے بہت متاثر نظر آئے۔ نعت کے بعد صدر محترم نے اعلان کیا کہ اب مشاعرہ کے پہلے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ لطیف گجراتی نے جو اسی کالج کے طالب علم ہیں۔ اپنے کلام سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ آپ کی غزل کے چند اشعار یہ ہیں :-

آئی ہے رات حسرتوں کا رُوپ دھار کے　　پھیلیں گے اور سلسلے اب زُلفِ یار کے
وہ آ گئے ہیں اس طرح زُلفیں سنوار کے　　اُترے ہوں جیسے قافلے ابرِ بہار کے

اب صدرِ مجلس نے اسی بزم اُردو کے نائب صدر جنابِ عابد ربّانی کو پکارا۔ عابد صاحب کے دو شعر آپ بھی سنیئے :- ؎

ڈھلنے لگا سُورج تو بڑھے شام کے سائے　　تم ہو کہ ابھی تک بھی نہیں لوٹ کے آئے
کس طرح کوئی حُسن تیرا دل سے اُتارے　　کس طرح کوئی تیری جوانی کو بھلائے

طلباء داد دیتے رہے۔ اور پھر جنابِ ناجی سبزواری سٹیج پر آئے اور آتے ہی اپنے "قہقہہ آور اشعار" کی بارش شروع کر دی۔ قہقہوں کا زور کم ہوا تو ہمارے کالج کے لیکچرار جناب انور شاہ ارشد ترمذی کہہ رہے تھے ؎

سینا ہے کہیں اور کہیں کرب و بلا ہے
ہر بار ترے وصل کا انداز جُدا ہے

ارشد ہے غمِ جاں ہے، غمِ جانِ جہاں ہے　　+　　اک بندۂ ناچیز پہ طوفانِ بلا ہے

اور اب ارشد ترمذی صاحب کے بعد نگرانِ بزم اُردو جناب پرویز پروازی صاحب کو پکارا گیا۔ آپ نے آکر بغیر ترنّم کے مگر ایک خاص طرز سے بے پناہ داد کے شور میں چند قطعات سُنائے جن میں سے ایک پیشِ خدمت ہے ؎

جام ایسا پلا دیا مجھ کو　　مر رہا تھا جلا دیا مجھ کو
تری آنکھوں کی جگمگاہٹ نے　　اک تماشہ بنا دیا مجھ کو

آپ کے بعد جناب سمیع اللہ قریشی کی باری آئی اور صدر مجلس نے پکارا کہ آئیے قریشی صاحب آپکی باری آئی۔ تشریف لائیں کہ بقولِ غالب ع　　کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں

اور قریشی صاحب نے یوں اپنا حالِ دل کہہ سُنایا ؎

ترے خیال کی آہٹ پہ دل دھڑکتا ہے　　کہیں اندھیروں میں آئی ہوئی صدا کی طرح
ہجومِ شوق میں ایسی بھی منزلیں آئیں　　خدا کے نام کو پوجا گیا خدا کی طرح

اور اب جناب نسیم سیفی اپنا کلام سُنا رہے تھے ؎

تجھ کو خبر نہیں کہ دل کو خبر نہیں ذوقِ طلب نہ ہو تو دُعا میں اثر نہیں
اک عمر تک جلیگا بہر حال روز و شب دل ہے نسیم کوئی چراغِ سحر نہیں

جناب نسیم سیفی آخری مقامی شاعر تھے۔ اب مہمان شعراء کی باری تھی۔ شمشاد صاحب نے گلزار ہاشمی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام سُنائیں۔ کیا درد انگیز تھا ان کا یہ بند اور کتنی پُر سوز تھی انکی آواز ؎

زندگی درد کا دوسرا نام ہے ہچکیاں سسکیاں اس کا انجام ہے
بس یہی سوچ کر دوستو عمر بھر سرد آہیں بھرو وقت ناساز ہے

سامعین اتنے محو ہو گئے تھے کہ جب گلزار صاحب غزل ختم کر کے چل پڑے تو بھی کچھ دیر کسی کو احساس نہ رہا۔ اور آخر کار جب وہ سٹیج سے اترنے لگے تو طلبہ نے وَنس مور۔ وَنس مور (ONE MORE) کی آواز سے ہال سر پر اُٹھالیا۔ اس طرح گلزار صاحب کو آنا ہی پڑا۔ ایک بند سُنیئے ؎

پھُنک رہا ہے جگر کون دیکھے ادھر اُٹھ رہا ہے دھواں کس کو احساس ہے
دُکھ بھری داستاں چھیڑ کر رائیگاں سوچتا ہوں یہاں کس کو احساس ہے

داد کا شور بہت بڑھ گیا تو صدرِ محترم نے جلدی سے جناب نظر امروہی کو پکارا۔ جناب نظر جانے پہچانے شاعر ہیں پچھلے سال بھی آئے تھے۔ انہوں نے غزل ترنم کے ساتھ سُنائی۔ ایک شعر سنیئے ؎

رخسارِ گل پر قطرۂ شبنم کو دیکھ کر ؛ پلکوں نے تیری یاد کے موتی پرو لئے

ایک اور مزیدار شعر سنیئے ؎

ہم امتیازِ رہبر و راہزن نہ کر سکے ؛ راہِ وفا میں جو بھی ملا ساتھ ہو لئے

اب تو آپ کو خوب ہی داد ملی۔ اب پھر جناب شرقی بن شائق غزل سرا ہوئے ؎

دل بھی کتنا بڑا پتھر ہے کہ پتھر ہی رہا ؛ ہم کبھی جلوۂ اصنام سے آگے نہ بڑھے

ان کی ایک دوسری غزل کے دو شعر سُنیئے!

پروردۂ بہار ہے لیکن ملول ہے ؛ دل ہے مرا یا کسی صحرا کا پھول ہے
یہ جتنی چاندنی ہے شبِ ماہتاب میں ؛ یہ ساری چاندنی تیرے قدموں کی دھول ہے

اب آپ کے بعد کلیم عثمانی کی باری آئی۔ اور جناب کلیم ہولے ہولے قدم اُٹھاتے سٹیج پر تشریف لائے۔ آپ پہلے بھی تشریف لاتے رہے ہیں اسی لئے پرانے طلبہ آپ کو جانتے تھے اور آپ کے ترنم کے مداح تھے اسلئے فوراً ہی آپکے تغزل و ترنم کو سُننے کے لئے گوشِ ہوش سے متوجہ ہو گئے۔ وہ کہہ رہے تھے ؎

رات کی زلفیں بھیگی بھیگی اور عالم تنہائی کا ٭ کتنے درد جگا دیتا ہے اک جھونکا پُروائی کا
عشق ہماری بربادی کو دل سے دُعائیں دیتا ہے ٭ ہم سے پہلے اتنا روشن نام نہ تھا رسوائی کا
تم ہو کلیم عجب دیوانے بات انوکھی کرتے ہو ٭ چاہ کا بھی ارمان ہے دل میں خوف بھی ہے رسوائی کا

اب علامہ لطیف انور سٹیج پر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ اگرچہ آپ لوگ نظم کو قبول نہیں کرینگے۔ کیونکہ آپ کا موڈ غزل کی طرف ہے۔ تاہم مَیں تو آپ کو ایک نظم ضرور سُناؤں گا۔ اور پھر آپ نے اپنی عینک کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

تری نگاہ کا اب تک کوئی اصول نہیں ٭ مذاقِ دید کو آوارگی قبول نہیں
ذرا سنبھل کے آ دامنِ نظر پھیلا ٭ چمن میں کانٹے بھی ہوتے ہیں صرف پھول نہیں

سامعین وطلبہ نے آپ کے اس خیال کو سراہا اور خوب ہی داد دی۔ آپ نے اسکے بعد ایک غزل سُنائی اور پھر مشاعرہ کے اس دور کے آخری شاعر جناب ثاقب زیروی اپنی مخصوص طرز اور ترنّم کے ساتھ فرما رہے تھے کہ ؎

دل جب احساس کی آنچوں سے پگھل جاتا ہے ٭ غمِ جاناں غمِ دوراں میں بدل جاتا ہے
چھیڑتا ہے جو کوئی تذکرۂ مہر و وفا
رنگ کیوں آپکے چہرے کا بدل جاتا ہے

ثاقب صاحب پر پہلا دور ختم ہوا۔ اب دوسرے دور میں صرف مہمان شعراء نے حصّہ لینا تھا۔ فرمائشوں کی چٹیں سٹیج پر آنی شروع ہو گئیں۔ صدرِ مجلس نے سب سے پہلے نظؔر امروہی کو پکارا۔ اب کے آپ ترنّم سے مخاطب ہوئے۔ ایک شعر سنیئے ؎

ہزار بار ترے غم کے ناز اُٹھائیں گے
غمِ حیات سے فرصت ذرا ملے تو سہی

آپ کے بعد گلزار ہاشمی کی باری آئی۔ طلبہ وسامعین نے جوش کے ساتھ نعرۂ مسرّت بلند کیا۔ اور گلزار صاحب آکر کہنے لگے ؎

ایک لمحہ کی رفاقت کو غنیمت جان لو
ساتھ جینا، ساتھ مرنا جُرم ہے اِس شہر میں

اور ؎ چلتے چلتے دیکھ لو اُجڑے ہوئے گلزار کو ٭ بے سبب یارو ٹھہرنا جُرم ہے اس شہر میں

آپ کے بعد علامہ لطیف انور نے غزل سُنائی۔ اٹھان یہ تھی ؎

کیوں تیری یاد عمر کا معمول ہو گئی ٭ تو یاد نہ آ۔ مجھ سے مگر بھول ہو گئی

آنکھوں میں دورِ جام نہ لب پر کوئی پیام ٭ پھر کونسی ادا تیری مقبول ہوگئی

اور اب کلیم عثمانی صاحب کو پکارا گیا۔ ان کے چند اشعار سماعت فرمائیے :۔

ع وقت کو دیکھ کے ہم بات بدل دیتے ہیں ٭ کوئی غم ہو اسے عنوانِ غزل دیتے ہیں

گل کھلائے نہ یہاں آج صبا سے کہدو ٭ لوگ ہنستے ہوئے پھولوں کو مسل دیتے ہیں

آپکے بعد جناب شرقی بن شائق سے درخواست کی گئی۔ چند ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

اب کس کو جھانکتی ہے دریچوں کی روشنی ٭ آواز دینے والے تو آواز دے گئے

کتنے ستم ظریف تھے یارانِ خوش مذاق ٭ آواز مر گئی تو ہمیں ساز دے گئے

اور پھر ایک اور غزل میں کہا ؎

دو چار زخم مجھ کو دئے اور بھلا دیا ٭ تم نے مری وفا کا بہت کم صلہ دیا

رسماً ہی پوچھ لیتے مجھ غمزدہ کا حال ٭ کچھ دوستوں نے یہ بھی تکلف اٹھا دیا

اور پھر ثاقب زیروی صاحب کی باری آگئی۔ پیشگی داد اور خوش آمدید کا سلسلہ ذرا رکا تو ثاقب صاحب کی آواز ابھری ؎

اک روشنی حدِ نظر دیکھتے تو ہیں ٭ اٹھتی ہے کب نقاب سحر دیکھتے تو ہیں

دامانِ لطف غیر پہ ہے غیر پر رہے ٭ مجھ کو یہ کم نہیں وہ ادھر دیکھتے تو ہیں

آنکھوں کو پھر یہ اشک بھی شائد نہ ہوں نصیب

وہ رو کے مجھ کو وقتِ سفر دیکھتے تو ہیں !

ثاقب صاحب نے ایک اور دردانگیز نظم سنائی اور یہی اس مشاعرہ کی آخری نظم تھی !!

ارشادِ نبویؐ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

"ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں اور وہ یہ ہیں کہ جب وہ تم سے ملے تو اسے سلام کرو۔ جب بلائے تو جا پہنچو۔ جب خیر خواہی کی خواہش کرے تو خیر خواہی کرو۔ جب چھینک کر "الحمد للہ" کہے تو "یرحمک اللہ" کہو۔ جب بیمار ہو تو عیادت کرو اور جب مر جائے تو اس کے جنازے میں شرکت کرو۔" (حدیث نبویؐ)

صابر زکی

افکارِ پریشاں

دیر تک ذہن سُلگتا رہا تنہائی میں!

اِس جہانِ خراب میں قریب قریب ہر کوئی دکھی ہے، غم و الم کی چاشنی کی لذت سے ہر ذی رُوح آشنا ہے، انسان مدارِ مسرت سے بھٹک گیا ہے۔ سبھی چہرے یاس و الم کی جھریوں سے نواز دیئے گئے ہیں۔ ہمہ وقت سراسیمگی کی سی کیفیت ہے ہر شخص پر، گویا کسی کی لگن میں کھو گیا ہے۔ اور اپنی منتشر ذات کو اِس بے پایاں جہاں کی وسعتوں میں تلاش کرنے کی سعیٔ ناتمام کا بیڑہ اُٹھا لیا ہے۔ اس بے پروبال مشتِ خاک کی تگ و دو، زندگی کو جلا دینے کی خاطر مدّت سے کوشاں ہے۔ کبھی اس نے عقل سے رہبری کروائی، کبھی جذبات کے دھارے میں بہہ کر جنوں فتنہ ساماں کا سہارا لیا۔ اور ایک بے نام سی سرمستی کے مارے بہل گیا۔

ابدی مسرتوں کا فقدان ہے اِس کارگہہ ہستی میں، ہر ذرۂ حیات ماحول کی سازگاری سے متاثر ہو کر بے ساختہ مسکرا دیتا ہے۔ لمحاتی سکون و اطمینان میسر آجاتا ہے، پر اس سے اگلے قدم پہ ہی غم و یاس کی وادیٔ پُرخار شروع ہو جاتی ہے، اور پھر یہ وادی کوئی مختصر سی وادی نہیں، بہت ہی طویل ہے۔ اس کا لامتناہی سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

کسی شے کو ثبات تو ہے ہی نہیں، ہر لمحہ ہر شے پہلو تہی کرتی نظر آتی ہے۔ ہر صبح کے افق سے سورج جداگانہ انداز سے طلوع ہوتا ہے، کبھی تو اس کی لانبی لانبی پلکیں ایک اندازِ بیباکانہ سے معصوم پتیوں پر پڑی ہوئی اوس کو چوم لیتی ہیں۔ اور کبھی شرماتی ہوئی آہستگی سے زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔ تغیر و انتشار ہے اس کائنات کی ہر شے میں۔ اس عالمِ رنگ و بو میں ننھے سے ننھا جرثومۂ حیات ہر آن اپنی ہیئت کو بدل لیتا ہے۔ خاصۂ فطرت ہے کہ یکسانیت سے ہر ذی روح اکتاہٹ محسوس کرتی ہے۔

تا زیست مسرت و انبساط کے خطوط پر چلتے چلے جانا قطعی ناممکن ہے۔ زندگی کی ان راہوں پہ ہمیشہ طمانیت ایسی کیفیت سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا، خوشی میں انسان افادیت دیکھتا ہے، پر یہی دراصل غموں کا صحرا ہے۔ زندگی کو قہقہوں کے ساز پر گاتے ہوئے آنسوؤں سے روشناس کرا دیا جاتا ہے۔ نوحوں

کے بے ربط ساز کھنکنے لگتے ہیں۔ اور زندگی میں وہ آہنگ وہ تسلسل یکبارگی مفقود ہو جاتا ہے۔ ان نوحوں کی لے کی لہریں طولانی ہوتی جاتی ہیں، مسرتیں بہت دور رہ جاتی ہیں، پھر اشکوں کی بہتات سے جی گھبرانے لگتا ہے۔ اسیرِ غم اسیرِ تنہائی ہو کر ذہن کے تاریک دھندلائے ہوئے گوشوں میں جھانکتا رہتا ہے یا عجب یاس و نا امیدی کی کیفیت ہوتی ہے یہ بھی!

اہلِ علم کی تحقیق کے مطابق ہمارا لاشعور چوری چھپے مستقبل کی بے ترتیب سی دنیا میں جھانکتا ہے، اور وہاں سے الٹی سیدھی معلومات حاصل کر کے شعور کو آگاہ کر دیتا ہے۔ پر اُدھر معاملہ کچھ اور ہے، غم سے آشنا شعور، لاشعور سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ شعور ہی میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مستقبل کی ہر شے براہ راست دیکھ سکتا ہے۔ یہ غم کے کرشمے ہیں کہ کامرانی کا تصوّر بھی خیالِ عبث ہو کر رہ جاتا ہے۔

کتنے مختلف ہیں زندگی کے دو پہلو،
پھول اور کانٹے۔
پھول ایک ناپائدار سی زندگی کے حامل،
کانٹے جن کو موت سے کوئی سروکار نہیں،
یہ کانٹے دامنِ زیست سے وابستہ ہو جائیں تو جبر کرنے کے باوجود مُسکرانا مفقود ہو جاتا ہے، آہ!
دیر تک ذہن سلگتا رہا تنہائی میں!

جواہر ریزے

- غصّہ دیوانگی ہے، اسے قبضے میں رکھو، ورنہ یہ تم پر قبضہ کر لے گا۔ (ہوریس)
- بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔ (حدیث نبویؐ)
- میں اپنے حریفوں پر اس لئے غالب آتا ہوں کہ وہ چند لمحوں کو عموماً کچھ نہیں سمجھتے اور میں ان لمحوں کی قدر و قیمت کو خوب سمجھتا ہوں۔ (نپولین)
- پھول کی صحبت میں رہنے سے بے شک مٹی کے ریزوں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے۔
(سوامی سارشد آنند جی)
- محنت ہی وہ سونے کی کنجی ہے جو دولت کے دروازے کھول دیتی ہے۔ (کالڈل)

(مرسلہ:- عبدالشکور اظہر)

محمد انور قریشی
بی اے، سال اوّل

طنز و مزاح

ایک خط ــ جو خط کم ہے، کسی مجذوب کی بڑ زیادہ

(چند ناموں کی تبدیلی کے ساتھ)

(نوٹ: المنار کے ایک گذشتہ شمارہ میں "ایک بے ضرر خط" پڑھ کر رگِ غیرت پھڑک اُٹھی۔ اسی پھڑکتی رگ کے ساتھ لکھا گیا، اپنی رگ پر ہاتھ رکھ لیجئے گا!)

ڈیئر ماجد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

واہ بھئی واہ (آپ کو تو نہیں کہہ رہا۔ مولانا! یہ تو ایک قلم کا نام ہے)

آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے اپنے آپ کو۔ ارے بھائی ہم تو اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں چار پکوڑے کھا کر یا منے کا لنگوٹ باندھ کر ہم پر رعب جماتے ہو۔۔۔۔ نکالوں قرولی ــــ لو پھر ایک شعر سُن لو ؎

واللہ کسی شوق کی خاطر نہیں پیتا
پیتا ہوں اس لئے کہ جل جائے جوانی

قصہ مختصر بلکہ المختصر تمہارا خط بڑا مزیدار تھا ــــ کہیں منہ میں پانی تو نہیں بھر آیا ــــ Sorry وہ تو تمہارا اپنا ہی لکھا ہوا تھا۔ دوسرے الفاظ میں تمہارا خط ملا۔ کیا سمجھے! اسے پڑھ کر ساجد کہہ رہا تھا کہ ہم بھی خط لکھیں گے۔ اپن کیا کسی سے کم ہیں۔ اپن بھی لکھنؤ کے بانکے ہیں۔ میں نے اسے ہر چند سمجھایا کہ "میاں ایسا غضب کیوں کرتے ہو۔ لیکن وہ نہیں مانتا۔ کہتا ہے کہ میں ضرور بھی لکھوں گا۔ اس لئے خبردار رہو۔ اُس کا خط کسی وقت بھی آسکتا ہے۔

منٹگمری کے موضع رینالہ خورد کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ وہاں "ایک کُتّے نے غلطی سے اپنے مالک کو کاٹ لیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ سخت شرمندہ ہوا اور رونے لگ پڑا۔ اس کُتّے نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ اور تین دن تک کچھ نہ کھایا پیا۔ بالآخر چوتھے روز وہ اسی غم میں مر گیا۔" لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ کُتّا نہ ہو گیا گاندھی جی کی بکری ہو گئی۔ جسے وہ اپنے ساتھ انگلینڈ لیکر گئے تھے۔ کیا بکواس ہے۔

یہ چیز کیا کسی اخبار میں شائع کرنے کے قابل ہے؟ لیکن میری بدقسمتی سے یہ ایک اخبار میں شائع ہو چکی ہے۔ اور اس پر ایڈیٹر کی ڈھٹائی تو دیکھو، لکھتا ہے کہ "کُتے کی اس وفاداری سے انسان کو سبق لینا چاہیئے۔۔۔۔۔" احمق کہیں کا۔ کہاں کُتا اور کہاں انسان۔ مثال بھی کیا دی نالائق نے۔ ویسے ساجد کا کتا "انتہائی کُتا" ہے ___ سو فیصدی خالص 'کُتا'، (لیکن بتانا نہیں کسی کو)۔ مجھے تو ایڈیٹر کی عقل پر رونا آتا ہے۔ کچھ کچھ ہنسی بھی۔

او اظہر! سیاہی لاؤ بھاگ کے ___ پن خشک ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔

تو مَیں کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ رینالہ خورد۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ یار تمہارا وہ عجیب الخلقت بکرا تو خدا جانے قیامت کی نشانی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ جو نسیان کی بیماری پھیلتی جا رہی ہے۔ یہ ضرور قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ اسی لئے میں نے حکیم سے کہہ دیا ہے کہ سوتے وقت بادام روغن کے دو دو قطرے کانوں میں ڈال کر سویا کرے۔ ورنہ اگر کوئی نقصان ہؤا تو میرا ذمہ نہ ہوگا ؎

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہیں ہوئی۔

میرا خیال ہے کہ آپ کی واپسی پر ہم یہاں حکمت کی ایک مشترکہ دوکان کھول لیں گے ___ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو! ___ باہر بورڈ پر لکھوا دیں گے کہ ضعف اور نسیان کے مریضوں کیلئے خوشخبری "تین دن میں مشرطیہ علاج ورنہ مرض واپس" کیا خیال ہے۔ یہ کیسا رہیگا۔ جگن کو ایجنٹ مقرر کر دیں گے۔ اور شوکت پراپیگنڈا سیکرٹری ہوگا۔ روزنامہ "پھکڑ تول" میں اشتہار دے دیں گے۔ کہ کمپنی کی مشہوری کے لئے ایک ہفتہ تک جلاب کی گولیاں مفت دی جائیں گی لیکن اگر اس دوران میں کوئی مر گیا۔ تو کمپنی تجہیز و تکفین کی ہرگز ذمہ وار نہ ہوگی۔

امید ہے کہ بڑے معقول طور پر بور ہو رہے ہو گے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

آپ کا بلکہ تمہارا (واقعی تمہارا)

کرم دین

نوٹ:۔ کہتے ہو گے کہ کیا واہیات خط لکھا ہے۔ تو بات یہ ہے پیارے کہ کوئی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ نکالوں قرولی۔۔۔۔۔ لگڑوں کوں۔۔۔۔۔ ماجد صاحب کھسکو!!۔۔۔۔۔

اللہ کے بندوں سے مجھے بَیر نہیں ہے
یعنی مری دنیا میں کوئی غیر نہیں ہے

صفدر علی
سال دوم (فنون)

ضمیر کی آواز

رشید نے سونے کے ارادے سے لمپ بجھایا اور لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نیند اُسکی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ بار بار اُسکے دل میں یہی خیال کروٹیں لے رہا تھا کہ وہ اپنی مشکلات سے کس طرح رہائی پائے۔ وُہ ایف اے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک ایک دن اُس کا باپ ایک موٹر کے حادثہ میں فوت ہوگیا۔ اُس کے والد کی کل جائداد ایک مکان تھا جس میں وہ رہائش پذیر تھا۔ اُن کا گذارہ والد کی تنخواہ پر تھا۔ باپ کے اچانک فوت ہو جانے سے گھر کی حالت ہی بدل گئی۔ رشید اور ناہید کے لئے والد ہی اُمّی اور ابّا دونوں کی جگہ تھا۔ باپ کے اچانک فوت ہو جانے سے اُس کے سُپنے ادھورے رہ گئے۔ وہ اپنے ارمان دِل میں لئے ہوئے چل بسا۔ وہ پیار سے کہا کرتا تھا کہ مَیں اپنے رشید کو بی اے کراؤں گا۔ اور اپنی ننھّی ناہید کو صرف میٹرک تک پڑھاؤں گا۔ لیکن اُسکی یہ تمنّائیں پُوری نہ ہو سکیں۔ وہ رشید کو ایف اے اور ناہید کو آٹھویں جماعت میں ہی چھوڑ کر چل بسا۔ اب رشید کے لئے تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اِس لئے اُس نے ملازمت کرنے کا ارادہ کیا۔ تین ماہ کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اُسے ایک دفتر میں کلرک کی جگہ ہی مل سکی۔ رشید نے اسے بھی غنیمت خیال کیا۔

وقت ڈھلتی چھاؤں ہے، چار سال کا عرصہ آنکھ جھپکتے گذر گیا۔ اب رشید سخت پریشانی کا سامنا کر رہا تھا کیونکہ ناہید جوان تھی اور اُس کی شادی کرنا ضروری تھا۔ رشید نے اپنی تنخواہ قلیل ہونے کے باوجود پانچ سو روپے جمع کئے تھے لیکن اس قلیل رقم سے جہیز کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر کار اُس نے سوچا کہ میں دو سو روپے اور جمع کر کے اپنی بہن کے ہاتھوں کو ضروری مہندی لگاؤں گا، خواہ مجھے کسی کی منت سماجت ہی کیوں نا کرنی پڑے۔ اُس نے رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ اُس کے قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جو اِس غریب اور یتیم لڑکی کو قبول کرتا۔ اِس لئے رشید نے اپنی ہمسائی کو اِس کام پر لگایا کہ کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کرے۔

ایک دن جب وہ دفتر سے آکر بیٹھا ہی تھا کہ اُس کی ہمسائی آئی اور اُس نے کہا کہ ناہید بڑی قسمت والی ہے۔ مَیں نے اس کے لئے وہ رشتہ تلاش کیا ہے کہ ساری عمر آرام سے گذارے گی اور وہ لوگ زیادہ جہیز کا بھی مطالبہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ رشید نے اُس کی باتوں سے مطمئن ہو کر ہاں کر دی۔ منگنی کی رسم ادا ہوئی۔ اور

طے پایا کہ اگلے چاند کی چودہ تاریخ کو ناہید اور جاوید کی شادی کر دی جائے گی۔ چنانچہ رشید نے تیاری شروع کر دی۔

شادی میں صرف دس دن باقی تھے۔ ناہید کی ہونے والی ساس رشید کے پاس آئی اور اُس نے کہا کہ جہیز خواہ کیسا ہو، لیکن دو ہزار سے کم کا نہ ہو۔ رشید کی امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ ناہید کی شادی کا چرچا ہو چکا تھا۔ اور اب صرف دس دن باقی تھے۔ اتنے قلیل عرصے میں وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس نے اپنے تمام رشتہ داروں اور دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ لیکن اُسے کسی نے پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ وہ سارے دن کا تھکا ماندہ چارپائی پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ یہ زمانہ کتنا سنگ دل ہے۔ ایک مجبور انسان کی مجبوری کو نظر انداز کر کے اپنا ہی فائدہ سوچتا ہے۔ اچانک اُس کے دل میں خیال آیا کہ اگر زمانہ میرے ساتھ اتنا ظلم کر رہا ہے تو مجھے بھی حق حاصل ہے کہ ہر جائز ناجائز طریقے سے اپنی بہن کے ہاتھوں کو مہندی لگاؤں۔ لیکن اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرنے لگا کہ چوری بہت بُرا فعل ہے۔ ایک طرف اُس کا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا اور دوسری طرف اُسکی بہن اپنے ہاتھوں کو مہندی لگائے کھڑی تھی۔ یکایک وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ لاہور جانیوالی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اُس نے اگلے اسٹیشن کا ٹکٹ لیا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اُسکے نزدیک ایک خوش پوش نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک رشید کی نظر اُس کی جیب پر پڑی جس میں ایک بٹوا نظر آ رہا تھا۔ اگلے اسٹیشن پر جب وہ نوجوان اُترنے لگا تو رشید بھی بھیڑ میں اُسکے ساتھ ہی اُتر پڑا۔ اُترتے وقت وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی ایک طرف کو چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دُور بجلی کے کھمبے کے نیچے اُس نے بٹوا کھولا۔ اُسکی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں کیونکہ بٹوے میں دس دس روپے کے کئی نوٹ تھے۔ جب اُس نے نوٹ گننے شروع کئے تو ایک نوٹ کی تہہ سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نیچے گر پڑا۔ رشید نے کاغذ کا ٹکڑا اُٹھا کر پڑھا تو اُس میں لکھا تھا:۔

پیارے بھائی! آپکو یہ تیسرا خط لکھ رہی ہوں۔ اب اُمّی جان کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں کیونکہ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کا علاج یہاں نہیں ہو سکتا۔ آپ اسے کشمیر کی پہاڑیوں پر لے جائیں اور ٹیکے وغیرہ جاری رکھیں لیکن گھر میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ ہمیں آج چوتھے دن کا فاقہ ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں لیکن ننھے خالد سے بھوک برداشت نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے ننھے خالد کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ اِس لئے جلد از جلد کہیں سے روپوں کا انتظام کر کے پہنچ جائیں۔

آپکی منتظر بہن
نسرین

رشید کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے نیچے گرے۔ اُس نے سوچا کہ دُنیا میں لوگ مجھ سے بھی زیادہ مجبور ہیں۔ یہ لوگ مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہیں۔ یہ سوچتے ہی وہ تیز تیز بھاگا اور ایک میل کے فاصلے پر اُس خوش پوش نوجوان کو جا ملا۔

"بھائی صاحب! یہ آپ کا بٹوا گر پڑا تھا، لے لیجئے۔"

اُس نوجوان نے احسان مند نگاہوں سے اِس رحمت کے فرشتے کو دیکھا اور بٹوا لے لیا۔

رشید اپنے ضمیر کو ملامت کرتا ہوا سر جھکائے گھر کی طرف چل دیا۔

اقبال کے چند اشعار

جس کے پھولوں میں اخوّت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

مجھے رو کے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

تمنّا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

اچھّا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

(مرسلہ:- ملک محمد رفیق اسد - ربوہ)

نئے لکھنے والے

پہلی کوشش

المنار کی پالیسی کے مطابق المنار میں نئے لکھنے والے طلباء کے مضامین بھی شامل کئے جاتے ہیں، ذیل کے تین مضامین طلباء کی پہلی کوشش کا ثمرہ ہیں۔ (ادارہ)

نسیم احمد اقبال
سال دوم (علوم)

روشنی کا مینار

(۱)

کائناتِ عالم کے ہر انسان کا اپنا اپنا اندازِ فکر اور نظریۂ حیات ہوتا ہے۔ جہاں تک حیاتیاتی اور فکری نظریے کے اختلاف اور تنوع کا تعلق ہے۔ وہ فطرتِ انسانی کا ایک خاصہ ہے۔ چنانچہ ازل سے ہر انسان زندگی کے مختلف درجوں میں ذہنی پختگی کے لحاظ سے اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کرتا رہا ہے ـــــ ان نظریات اور خیالات کا اظہار کوئی حادثاتی عمل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بچپن ہی میں اپنے گرد و نواح کے معاشرہ سے جنم لیتے ہیں۔ جوں ہی بچہ عالمِ آب و گل میں جنم لیتا ہے، خدائے عزّ وجل اُس کے دل میں اُمید، آرزو اور ترنگ پیدا کر دیتا ہے۔ اور جوں جوں نومولود عہدِ شباب کی طرف قدم بڑھاتا ہے، توں توں اُسکی اُمیدوں اور آرزوؤں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کو اپنا نصب العین خیال کرنے لگتا ہے۔ اور پھر وہ اپنے اس مقصد کو پانے کیلئے ہمہ گیر کوشش کرتا ہے۔

آدمی کی عادات اور خصائل کا وافر حصّہ اُسے اپنے والدین اور معاشرہ سے ملتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے قریب کی اشیاء سے زیادہ متأثر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اُس کا تعلیمی دور شروع ہوتا ہے تو وہ اپنے مکتب سے بالکل نئے رُوپ میں نکلتا ہے۔ لیکن وُہ اسے جلد ہی فراموش کر دیتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ خانگی جھگڑے، تنازعات اور تعلیم و تربیت کا فقدان ہے۔ اِس طرح سے اُس کے وہ نظریات اور خیالات منتشر ہو جاتے ہیں اور اپنے مقاصد کے متعلق اُسکی اُمیدوں کے محل پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُسکے والدین کم علمی اور جہالت کے باعث یہ نہیں جانتے کہ بچّہ کی ذہانت پر بہت بُرا اثر ہو رہا ہے۔ بعض لوگ اپنی معصومیت کے باعث زندگی بھر خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں

اُن کا استقبال کرتی ہیں پھر بھی منزل کے فریب میں اُمیدوں کے چراغ لیئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ حقیقت اُن پر کھُل جاتی ہے اور امیدوں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ انہیں کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی اور وہ منزلِ مقصود کے متلاشی، تھکے ماندے مسافر کی طرح تاریکی اور ظلمت کے طوفانی سمندر میں کھو جاتے ہیں۔

خالقِ کائنات نے ترقی اور مسابقت کی رُوح فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے۔ اِسی کا نتیجہ ہے کہ ہر انسان کے اندر شدید طور پر قوتِ تمیز پائی جاتی ہے۔ یعنی نیکی اور بدی، اچھائی اور بُرائی، پستی اور بلندی کو خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ اور اسی فکری نظریہ کے تحت اپنے لئے ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد متعین کرتا ہے۔ اور اسکے حصول کیلئے تن من دھن کی بازی لگا دیتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو روشنی کا ایک مینار سمجھتا ہے اور اُس تک پہنچنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔

غرض روزگارِ زمانہ کی مخالفت اور طوفانی ہواؤں کے جھونکے اُسکے چراغِ اُمید کو گُل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ لیکن پختہ عزم رکھنے والا انسان ہر وقت اپنے مقصد کا متلاشی رہتا ہے اور بالآخر یہی لوگ ہی کامیابی و کامرانی کا تاج اپنے سر پہ رکھتے ہیں۔

انسان کو کامیاب زندگی گزارنے کا کوئی سنہری اصول ضرور متعین کرنا چاہیئے۔ اِسکے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش کے حالات اور اپنے عزائم کا خوب اچھی طرح تجزیہ کرتے ہُوئے مقصد کا تعین کرے۔ اِس مقصد کے حصول کے لئے جس استقامت اور پختگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جبتک وہ انسان نفس کُشی کیلئے تیار نہ ہو۔ نفس کشی سے انسان کی قُوّتِ ارادی بڑھتی ہے اور کامیابی کا اصل راز قُوّتِ ارادی کی استقامت پر مبنی ہے۔ پس اپنے مقصد میں کامیابی کیلئے ہر انسان کو اِن بنیادی مراحل کو طے کرنا پڑیگا۔ اسکے بغیر مقصد کا حصول مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ اور بغیر مقصد کے زندگی بالکل بے فائدہ اور بیکار ہے۔ انسان نے عظمت و آدمیت اور رفعت و انسانیت کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اور اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے اُس کا مقصد بلند سے بلند تر ہونا چاہیئے۔

خلیل اللہ طاہر
سال دوم۔

موسمِ بہار میں ایک دن

(۲)

موسم بہار کی چھٹیاں ہو چکی تھیں — میرے چند دوست سعید اور انیس چاہتے تھے کہ دُور — بہت دُور — نیلی نیلی پہاڑیوں کے اُس پار — جھیل کے کنارے مچھلی کا شکار کھیلیں — پہلے تو میں جانے سے کترا رہا کہ امتحان بہت نزدیک ہیں — مگر اُن کا کہنا تھا کہ آج موسم بہت سہانا ہے — آخر انہوں نے مجھے راضی کر ہی لیا اور ہم چل دیئے۔

صبح سویرے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑے وسیع و عریض آسمان پر اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے دکھائی

دے رہے تھے۔ بارش کا ہونا ناممکن تھا۔ لہٰذا یہ خیال کرتے ہوئے دُور ـــ بہت دُور گاؤں میں سیر کرنے نیز مچھلی کا شکار کرنے روانہ ہو گئے ـــ

پرندوں کے غول کے غول شور مچاتے ہوئے اپنے بسیروں سے نکل کر محوِ پرواز تھے ـــ رات بھر کے ستائے ہوئے اور تازہ دم کسان و مزدور کدالیں اور ٹوکریاں کاندھوں پر رکھے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے۔ اپنے اپنے کام کاج پر روانہ ہو رہے تھے ـــ مگر ـــ ہم آہستہ آہستہ سُست روی کے ساتھ سہانے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ـــ گاؤں میں داخل ہو رہے تھے ـــ

ذرا پرے بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں ایک مؤثر سا نغمہ فضا میں بکھیر رہی تھیں۔ اب دیہاتی عورتیں اپنے بستر، چارپائیاں اور دیگر کھانے پینے کا سامان اُٹھائے گاؤں سے ذرا پرے ـــ دریا کے کنارے جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں ـــ

سورج کی سنہری کرنیں تیرتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں کو چیرتی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں جذب ہو رہی تھیں ـــ ایسے میں دُور ـــ بہت دُور کہیں گڈریے کی جادو بھری آواز مست بنا رہی تھی ـــ

ہری بھری سرسبز و شاداب پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ اور اُن پر لمبے لمبے درخت کچھ عجیب بہار پیدا کر رہے تھے ـــ ہم ان دلفریب مناظر میں کھوتے ہوئے ـــ قدرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے ـــ اور باتیں کرتے ہوئے پگڈنڈی پر رواں دواں بڑھتے رہے ـــ اور چند گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم اُسی جھیل کے پاس پہنچ گئے جہاں ہم نے مچھلیوں کا شکار کرنا تھا۔

جھیل کے کنارے خودرو پھولوں کے ننھے ننھے پودے ـــ کئی قسم کے پھول سُرخ، سفید، زرد گلابی اور نیلے جیسے کسی نے گلدستوں میں خاص سجا کر رکھے ہوں ـــ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

پھر ہم نے اُسی جھیل کے قریب ایک بہت بڑے گھنے درخت کے تلے اپنا سارا سامان رکھ دیا۔ اور تھوڑی دیر تک جھیل کے کنارے ٹہلتے رہے ـــ پھر شکار کرنے کیلئے کُنڈیاں ٹھیک ٹھاک کیں۔ اور پانی میں ڈال دیں ـــ مچھلی کا شکار واقعی بہت صبر آزما ہوتا ہے ـــ سانس روک کر گھنٹوں صمٌ بکمٌ بیٹھے رہنا آسان کام نہیں ـــ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ ہم نے تھوڑی سی دیر میں بہت سی مچھلیاں پکڑ لیں ـــ اب تھکاوٹ کے ساتھ بھوک کی شدت بھی بڑھتی گئی ـــ یہی مناسب سمجھا کہ کچھ کھا لیا جائے ـــ

پراٹھوں سے بھوک مٹائی ـــ تھک کر چور ہو چکے تھے، چنانچہ فیصلہ کیا کہ یہیں درخت کے نیچے کچھ آرام کر لیا جائے ـــ اچھا خاصا تھکے تھے۔ لہٰذا نیند فوراً آ گئی ـــ جب اُٹھے تو شام ہو چکی تھی ـــ نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ بس حیران رہ گئے ـــ

ہم نے مچھلیوں کو ایک محفوظ جگہ پر رکھ کر دوبارہ اردگرد کے خوبصورت مناظر کو دیکھنا شروع کیا ـــ

کبھی پاؤں پانی میں لٹکاتے ــــ کبھی پہاڑی کے دامن میں چھوٹی چھوٹی آبشاروں کا مشاہدہ کرتے ــــ اور کبھی مرغابیوں کے گروہوں پر نظر دوڑاتے ــــ میری نگاہیں خاموش پانی کی ننھی لہروں میں کسی چیز کو گھور رہی تھیں ــــ رنگا رنگ کے پتے پانی میں بہہ رہے تھے ــــ گاہے گاہے کسی ریتلے ابھار یا پانی میں اُگی ہوئی جھاڑیوں سے ٹکرا کر رک جاتے ــــ آہستہ آہستہ پتوں کا ڈھیر لگ جاتا ــــ مگر جب ہوا کا تیز جھونکا آتا تو یہ ڈھیر دھیرے دھیرے پھر بہنے لگتا ــــ

بڑی دیر تک ہم یونہی پھرتے رہے ــــ اچانک آسمان پر کالی بدلیاں چھانے لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پُرسکون ماحول کچھ عجیب سا ہوگیا ــــ مگر ہم نے کچھ پرواہ نہ کی اور اپنے کام میں مشغول رہے۔

شام کافی ہوچکی تھی ــــ چنانچہ میں نے واپس چلنے کی تجویز پیش کی۔ سائے ڈھندلے ہو چلے تھے۔۔ پرندوں کے غول کے غول شور مچاتے ہوئے اپنے آشیانوں کی جانب محوِ پرواز تھے ــــ

پسینے سے شرابور ــــ تھکے تھکے سے مضمحل کسان اور مزدور کدالیں اور ٹوکریاں کاندھوں پر رکھے، دن بھر کی مشقت کے بعد سست رفتاری کے ساتھ بھاری بھاری قدم اُٹھاتے ــــ حقّے کے کش لگاتے ہوئے ــــ گاؤں میں داخل ہو رہے تھے ــــ

مدھم روشنی شام کے دھندلکوں سے گلے مل کر ان میں جذب ہوچکی تھی۔ لیلائے شب نے اپنے سرمئی لبادہ کو پھیلاتے ہوئے ایک طویل انگڑائی لی ــــ اور آکاش آناً فاناً سیاہ ہوگیا ــــ زمین و آسمان کی فضائے بسیط پر ظلمت و تاریکی نے تسلط جمالیا۔

ہم اتنے تھک چکے تھے کہ ذرا بھر تیز قدم نہ اُٹھا سکتے تھے۔ بھوک کی شدت پھر بڑھتی جا رہی تھی ــــ مگر مجبور تھے کہ کوئی چیز کھانے کو نہ تھی۔ راستے میں ایک چھابڑی والے سے کچھ بیر لیکر دوزخِ شکم کو ٹھنڈا کیا۔ شام ہونی شروع ہوچکی تھی ــــ مگر ہم ابھی اپنے شہر سے کافی دُور تھے۔ لہذا مجبور ہو کر تیز تیز قدم اُٹھانے لگے۔ اور صبح کے نکلے ہوئے سات آٹھ بجے شام تھکے ماندے گھر پہنچے تو بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔

انیس احمد جاوید

حسرت!

جب گوں گوں کی آواز اُسکے کانوں میں پڑی تو وہ بھینسوں کو چارہ ڈال رہا تھا، آواز کو سنتے ہی وہ باہر بھاگا۔ اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مگر ہوائی جہاز آگے گذر چکا تھا، پھر اُس نے گاؤں کا طواف کرنا شروع کردیا لیکن اُس کی حسرت بھری نگاہیں دیکھتی رہ گئیں ــــ وہ گلی کی نکڑ پر کھڑا تھا۔ اور اُسکے چچا کا بڑا لڑکا اسکو ڈھونڈ رہا تھا۔ اچانک اُسکی گال پر ایک زوردار طمانچہ پڑا اور ساتھ ہی گالیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ اُسکو دائیں کان میں پہلے درد سا محسوس ہُوا۔ پھر کھچاؤ سا، اور وہ کان اُس کو لیئے گھر پہنچ گیا۔ ابھی وہ گھر سے باہر تھا کہ ایک عورت کی زبان جو کہ بڑی تیزی سے گالیاں

چھوڑ رہی تھی، یہ اُسکی جانی پہچانی آواز تھی جو اُسکو روزانہ بلکہ ہر وقت لعنت ملامت کیا کرتی تھی، یہ اُسکی چچی تھی۔

وہ کون تھا؟ وہ شامو تھا جسکی عمر قریباً چودہ سال تھی۔ وہ ابھی چھوٹا ہی تھا کہ اُس کا والد اور والدہ آفاق کی منزل کا سفر ختم کر چکے تھے۔ اب وہ اپنے چچا کے پاس رہتا تھا۔ اُس کا چچا شہر میں کسی سیٹھ کے پاس ملازم تھا۔ وہ روزانہ شام کو گھر آجایا کرتا تھا۔ اُس کا چچا اُس سے بہت پیار کیا کرتا تھا، باقی سب اُسکو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بچپن سے ہی اُسکے دل میں ہوائی جہاز کے دیدار کی لگن بیٹھ چکی تھی، وہ ہوائی جہاز کی آواز پر دیوانہ وار دوڑ پڑتا تھا۔

ایک دفعہ وہ دُودھ دوہ رہا تھا کہ اچانک ہوائی جہاز کی آواز اُسکے کان میں پڑی۔ وہ بالٹی وہیں چھوڑ کر دوڑ پڑا۔ جس طرف سے ہوائی جہاز کی آواز آرہی تھی وہ اس طرف جا رہا تھا کہ راستہ میں کانٹوں کی باڑ آگئی وہ دیوانہ وار اسمیں گھس گیا اور اپنے جسم کو چھلنی چھلنی کر لیا۔ اور ہوائی جہاز کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اُس کا دماغ ہر وقت سوچا کرتا تھا کہ وُہ دن کیسے آئے کہ مَیں ہوائی جہاز کو قریب سے سیر ہو کر دیکھ سکوں اور اپنی خواہش کو پُورا کر لوں۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آجاتا کہ جب مَیں ہوائی جہاز کے قریب پہنچوں گا، تو میں ملازموں سے آنکھ بچا کر اُسکو ہاتھ بھی لگا لونگا۔ اُسوقت اُسکا دِل خوشی سے بھر جاتا۔ ہوائی جہاز ہر تیسرے دن اُسکے گاؤں پر سے پرواز کرتا ہُوا گذرتا تھا، تو اُسکے ماہر کان اور تیز نظر رکھنے والی آنکھیں ہوائی جہاز کو دیکھنے میں کبھی ناکام نہیں ہوتی تھیں۔ مگر آج وہ دیکھنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ حسرت بھری نگاہ سے آسمان کے ستاروں کی طرف دیکھ رہا تھا اور خیالات کی دنیا میں کھویا ہُوا تھا۔ نیند کوسوں دُور تھی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ صبح جب چچا شہر کو جائیں گے تو کہونگا کہ مجھے بھی شہر لے چلیں میں نے شہر کبھی نہیں دیکھا۔ پھر مَیں اُن سے کہونگا۔ مجھے آپ یہیں رکھ لیں میں بھی کوئی کام کرتا ہوں۔ اِس طرح میں اپنی خواہش کو پُورا کر لوں گا۔ پھر اُس نے سوچا کہ اب سو جانا چاہیئے۔ صبح جب چچا جانے لگیں گے تو کہہ دُونگا۔ مگر نیند کا آنا ابھی مشکل تھا۔

آخرکار نیند نے اپنا سفر ختم کیا اور اُس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صبح جب اُس کا چچا جانے لگا تو اُس نے اپنے چچا سے کہا کہ مَیں نے شہر کبھی نہیں دیکھا آپ اپنے ساتھ شہر لے جائیں۔ تو اُس نے کہا کہ جب مَیں جاؤنگا تو ساتھ لے چلوں گا۔ جب شامو شہر پہنچا تو اُس کا چچا اُس کو اپنے ساتھ سیٹھ جی کے گھر لے گیا۔ سیٹھ جی نے اُس کے چچا سے پوچھا، یہ کون ہے۔ چچا نے کہا۔ میرا بھتیجا ہے۔ سیٹھ نے کہا۔ آپ اِسے یہیں رکھ لیں گھر کا کوئی سودا وغیرہ لا دیا کریگا۔ اس کا چچا مان گیا۔ شامو کی خواہش اب آخری مراحل پر تھی۔ اور اُس کا دِل خوشی سے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ لیلائے شب جلوہ افروز ہو چکی تھی۔ شامو اپنے چچا کے ساتھ ہی سو گیا۔ جب صبح ہوئی تو سیٹھ کی بیوی نے کہا۔ شامو جاؤ دہی تو لے آؤ۔ شامو دہی لینے نکلا۔

وہ بازار سے گذر رہا تھا۔ بازار میں رکشے، کاریں، سکوٹر وغیرہ اور دُکانوں میں اُسکے لئے عجیب عجیب چیزیں پڑی تھیں۔ مگر شامو اُن کو نظر انداز کرتا ہُوا گزر رہا تھا۔ اسی طرح دو تین دن گذر گئے۔ مگر شامو جس دن کی

انتظار میں تھا، وہ نہ آتا تھا۔ ایک دن شآمو نے ارادہ کیا کہ آج میں ضرور ہوائی جہاز کے اڈّہ پر جاؤں گا۔ شآمو بازاروں میں سے گذرتا ہوا جا رہا تھا۔ مگر اس کو یہ پتہ نہیں تھا کہ ہوائی جہاز کا اڈّہ کہاں ہے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی مگر شآمو تیز تیز قدم اُٹھائے جا رہا تھا۔ بازار میں بھیڑ تو کافی تھی اِس لئے شآمو کبھی موٹر اور کبھی کار کے آگے سے دوڑ کر گذر جاتا۔ لیلائے شب نے پہلی انگڑائی لی، تو سُورج غروب ہوگیا۔ اب شآمو بڑی شاہراہ پر سے گذر رہا تھا۔ کہ پیچھے سے رکشا گذرا مگر شآمو بھاگ کر اُس سے بچ گیا۔ مگر پیچھے سے ایک بڑی تیز رفتار کار پوں پوں کرتی ہوئی آئی اور شآمو کو دھکیلتی ہوئی گذر گئی۔ شآمو اپنی حسرت کو دِل میں لئے دم دے گیا۔

میرے پسندیدہ اشعار

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

(مجاز)

○

کبھی ساحل پہ رہ کر شوق، طوفانوں سے ٹکرائیں
کبھی طوفاں میں رہ کر فکر ہے ساحل نہیں ملتا

(مجاز)

○

شاید مجھے نکال کر پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

(عدم)

○

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل دل سے نہیں ملتا

(مجاز)

○

مَیں نے جو پھول چنے تھے تیرے قدموں کے لئے
ان کا دھندلا سا تصور بھی میرے پاس نہیں

(ساحر)

(مرسلہ:۔ ظفر احمد ربوہ)

پگڈنڈیاں!

"پگڈنڈیاں" المنار کا مستقل کالم ہے۔ اس عنوان کے تحت ایسے صحیح واقعات شائع ہوتے ہیں جو اپنے اندر ایک جدّت رکھتے ہوں اور دل پر گہرا اثر چھوڑتے ہوں۔ طلباء کا اپنا کام ہے کہ اس کالم کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنائیں۔ (مدیر اعلیٰ)

آزادی کے بعد!

گرمیوں کی ایک گرم دوپہر تھی، اور ہم نہر کے کنارے بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ صبح کے وقت چند ساتھیوں نے نہر میں نہاؤ کی تیزی کے پیشِ نظر اُس کے آر پار ایک رسّہ باندھ دیا تھا۔ تاکہ درمیان میں تیرتے ہوئے تھک جانے والے سہارا لے سکیں۔ اچانک دُور سے اُڑتی ہوئی گرد اور پھر تیزی سے آتی ہوئی ایک موٹر سائیکل دکھائی دی۔ جس پر پولیس کے دو افسر سوار تھے۔ چونکہ رسّہ اُن کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ اور تیز رفتاری کی وجہ سے امکان تھا کہ شاید انہیں نظر نہ آسکے، لہٰذا انہیں ٹھہرانے کے لئے بیک وقت کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ مگر یہ احتیاطی تدبیر بعد از وقت ثابت ہوئی۔ اور موٹر سائیکل ڈرائیور آوازوں کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اور اُدھر موٹر سائیکل رسّہ سے جا ٹکرائی۔ نتیجۃً اُن کی گردن پر رسّہ کی رگڑ سے خون نکل آیا۔ اور اُن کے پیچھے بیٹھے ہوئے صاحب کے چہرے پر زخم آگیا۔ اور وہ اس زور سے پُشت کے بل زمین پر گرے کہ تقریباً نصف فرلانگ دُور ہونے اور پانی کے شور کے باوجود اُس کی آواز ہمیں صاف سُنائی دی۔ موٹر سائیکل رُک گئی۔ ہمارے چند بزرگ نہر کی دوسری طرف گئے اور نوجوانوں کی اس غلطی پر جس سے انہیں یہ تکلیف پہنچی تھی، معذرت کی۔ ہر دو پولیس کے ممتاز افسران میں سے تھے۔ اتنے میں اُن کے ساتھی پولیس کے سپاہی بھی پیچھے سے آگئے۔ وہ سب کسی مقدمہ کی تفتیش کے بعد واپس لوٹ رہے تھے۔ آپ خیال کر رہے ہونگے کہ انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر چالان کی دھمکی دی ہوگی۔ لیکن آپ یہ سُنکر شاید حیران ہوں کہ انہوں نے معذرت قبول کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو معمولی بات ہے۔ اور

"گرتے ہیں شاہ سوار ہی میدانِ جنگ میں"۔

ماضی میں جبکہ ہم غلامی کے بدھنوں میں جکڑے ہُوئے تھے، پولیس کے افسران سے اِس معقول اور شریفانہ رویہ کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس واقع سے پتہ چلتا ہے کہ اب وہ بھی مہذب ممالک کے باشعور شہریوں کی طرح اپنے فرائض بخوبی سمجھتے ہیں۔ مَیں اُن کے اِس برتاؤ کو آزادی کی برکت سمجھتا ہوں۔

(عطاء الکریم شاہد اولڈ بوائے)

اُخوّت

تقریباً شام ہونے کو تھی۔ مَیں نے گوجرانوالہ کا ٹکٹ لیا اور بس میں سوار ہوگیا۔ بس میں میرے سوا صرف ایک ہی اور مسافر تھا جو کہ بڑھاپے کی وجہ سے بہت ہی کمزور ہو چکا تھا۔ میرے خیال میں وہ اِس وجہ سے کہ موسم ٹھیک ہے کوئی کپڑا وغیرہ ہمراہ نہ لایا تھا۔ اُس نے بھی گوجرانوالہ ہی جانا تھا۔ ابھی کوئی بیس پچیس میل سفر ہی طے ہونے پایا ہوگا کہ موسم یکلخت بدل کر شدید سرد ہوگیا۔ اور تیز ٹھنڈی ہوا بھی چلنے لگی جس سے بوڑھے آدمی کو بخار ہوگیا اور اس پر کپکپی طاری ہوگئی اتفاقاً اُسوقت میرے پاس بھی کوئی کپڑا نہ تھا۔ اِس لئے سوائے دُعا کے مَیں بیچارے کی کوئی مدد نہ کرسکا۔ حافظ آباد کے قریب پہنچے تو ایک نوجوان بس میں سوار ہوا۔ اُسے بوڑھے کی اِس حالت پر رحم آیا اور اُس نے اپنے اُوپر کا کمبل اُتار کر اُسکے اُوپر دیدیا۔ میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا خدایا شکر تُو نے میری دُعا قبول کی اور ساتھ ہی نوجوان کیلئے بھی دُعائیہ کلمات نکلے بوڑھے کی حالت آہستہ آہستہ ٹھیک ہوگئی۔ رات کے تقریباً نو بجنے والے تھے، خدا خدا کر کے گوجرانوالہ کا بس سٹاپ آیا۔ اُترتے وقت نوجوان پر جو نظر پڑی تو دیکھا کہ وُہ سردی سے ٹھٹھرا ہوا بس کے ایک کونے میں لگا پڑا تھا۔ بزرگ نے اُسے کمبل واپس کیا اور دُعا دیتا ہوا چلا گیا۔ نوجوان کی اِس ہمدردی کو دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اور مَیں کسی شاعر کا یہ مصرع دُہرانے لگا کہ ؎ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں،

(قریشی برکات احمد خالد سال دوم)

عظمتِ انسان

"سندر بن" کے گھنے جنگلات میں ایک کروڑ پتی نوجوان کی کار رات کی تاریکی کا سینہ چیرتی۔ گولی کی طرح سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔۔۔ یکایک اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دندناتی ہوئی کار کی بریک اتنے زور سے لگی کہ اُس کے پچھلے پہیے دس دس انچ زمین میں دھنس گئے۔ کروڑ پتی جلدی سے نیچے اُترا۔ سامنے سڑک پر ایک بھکاری اوندھے مُنہ پڑا کراہ رہا تھا۔ کیوں کیا ہوا تمہیں؟ کروڑ پتی نے فقیر سے انتہائی ملائمت کے لہجہ میں استفسار کیا۔ جی۔ بابو۔۔۔ جی۔ بھکاری نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ کروڑ پتی نے جلدی سے اپنی نکٹائی کھول لی

اور بھکاری کے زخم پر مضبوطی سے باندھ دی، تاکہ زہر کا اثر جسم کے دُوسرے حصّوں کو زہریلا نہ بنا دے ۔ پھر اس نے موٹر کی پچھلی نشست پر اس بھکاری کو لٹا دیا، اور کار پھر طوفانی رفتار سے نزدیکی شہر کی طرف بھاگنے لگی۔ ایک گھنٹہ کے بعد کار ایک بہت بڑے ہسپتال کے گیٹ پر کھڑی تھی ۔ اِس ہسپتال میں صرف وہی لوگ علاج کروانے آتے تھے، جن کے پاس دولت کی افراط ہو۔

ڈاکٹر اسلم ۔ ذرا جلدی لے جاؤ اس کو ۔ کروڑپتی نے بھکاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ یہ میرا بھائی ہے ۔ اِس کا علاج جتنا جلدی ہو سکے ۔ کرو ۔ مَیں پوری پوری ادائیگی کر دونگا ۔ ڈاکٹر اسلم نے مجھے بتایا کہ کروڑپتی کے منہ سے ایک فقیر کیلئے "بھائی" کا لفظ سُنکر انسانیت کی مقدس رُوح نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں ۔ اور مَیں نے بھی اس بھکاری کا علاج بغیر کسی معاوضہ کے کر دیا ۔ ڈاکٹر اسلم خود بھی لاکھوں میں کھیلتے ہیں ۔ مگر آج بھی وہ امارت و غربت کے نشیب و فراز انسانیت کی ایک جست کے سامنے حقیر و ادنیٰ جانتے ہیں ۔ دراصل عظمتِ انسان ڈاکٹر اسلم جیسے اور اس نیک فطرت کروڑپتی جیسے وجودوں میں ہی نظر آتی ہے ۔

(منور احمد الیف ۔ ایس سی I)

یہ واقعہ چند سال قبل کا ہے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب بھی ہے۔ ہمارے رشتہ کے ایک ماموں ان دنوں بسلسلہ ملازمت ڈھاکہ میں مقیم تھے جبکہ یہ واقعہ یا یوں کہئے کہ یہ حادثہ پیش آیا۔ انکی شادی کو ایک سال کا عرصہ گذرا تھا جب اُنکے ہاں پہلا لڑکا تولّد ہوُا۔ تو انہوں نے گھر والوں کو یہ خوشخبری سُنانے کیلئے تار دیا۔ مگر وہ اپنی مذاقیہ طبیعت کی بدولت اِس موقعہ پر بھی مذاق کرنے سے نہ چوکے اور تار میں یہ عبارت تحریر کی:- "..... DID THAT SURRAYYA OF IRAN COULD NOT DO."

چند گھنٹے بعد یہ تار گھر ملا۔ اور معمول کے مطابق رواں دواں زندگی میں ایک تہلکہ بپا ہوگیا۔ تمام گھر میں رونا پیٹنا شروع ہوگیا۔ اور گھر کے ہر فرد کا چہرہ افسردہ و غمگین دکھائی دیتا تھا اور ہر ایک رونی صورت بنائے پھرتا تھا۔ یہ خبر تمام خاندان میں جنگل کی آگ کیطرح پھیل گئی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد اس گھر میں افسوس کرنیوالوں کا تانتا بندھ گیا۔ گھر میں آنیوالے ہر شخص کی آنکھیں پُرنم اور ہر دِل پُر درد بنا تھا۔

معًا کسی کو خیال گذرا کہ تار تو دیکھی جائے۔ انہوں نے تار سے متعلق دریافت کیا اور اس تار کے مبہم سے الفاظ پر غور کرنے لگے۔ اور پھر تار گھر کی جانب چلدیئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو ہنس رہے تھے۔ ہر ایک نے بُرا منایا اور انکو کوسنے لگے کہ اس طرح ہنسنے کا کونسا موقع ہے۔ مگر وُہ تھے کہ برابر مُسکرائے جارہے تھے۔ بالآخر انہوں نے تمام اہلِ خانہ کو تسلّی دی اور بلا کر اپنے گرد جمع کرلیا۔ اور پھر سب کو ایک ایسی بات بتائی کہ وہی افراد جنکی وجہ سے گھر بھر میں کہرام برپا تھا اور رونے رُلانے سے قیامت کا سماں بپا تھا۔ گھر میں انکے قہقہے بلند ہو رہے تھے اور زندگی دوبارہ معمول پر آگئی تھی۔ یہ تمام واقعہ چند گھنٹے میں ختم ہوگیا اور اسکی مثال ایک ایسے ڈرامہ کی مانند تھی جس کا آغاز المیہ اور انجام طربیہ ہو ۔ آپ بھی حیران ہونگے کہ معاملہ کیا ہے۔ تو سُن لیجئے کہ جب تار گھر میں ملا تو اسپر محکمہ متعلقہ کی غلطی سے فقرہ کچھ اِس طرح بن گیا تھا:- "..... DIED THAT SURRAYYA OF IRAN COULD NOT DO."

اُدھر ان صاحب نے جب تار دیکھا تو انہیں کچھ شبہ ہوُا۔ جب وہ ڈاکخانہ پہنچے تو معلوم ہوُا کہ واقعی تار میں غلطی ہے اور وہ غلطی DID کی بجگہ DIED لکھ دینے کی ہے۔ اس طرح اس واقعہ کا ڈراپ سین ہوُا اور ایک شخص کا مذاق کئی افراد کیلئے وبالِ جان بن گیا۔ اور لمحہ بھر پہلے گھر میں ایک کہرام بپا ہوُا۔ قیامت کا سا سماں چھا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ قہقہے بلند ہونے لگے۔

(سید نعیم حیدر)

رنگِ تغزّل

- ثاقب زیروی
- کلیم عثمانی
- گلزار ہاشمی
- نظر امروہی
- بشارت احمد جمیل
- سعادت علی سیّد
- مبارک احمد عابد
- محمد اقبال رانجھا
- قمر کاشمیری
- مسعود احمد پرویز
- لطیف گجراتی
- عبدالرشید قریشی

ثاقب زیروی

اک روشنی سی حدِّ نظر دیکھتے تو ہیں
اُٹھتی ہے کب نقابِ سحر دیکھتے تو ہیں

دستِ کرم بڑھے نہ بڑھے یہ رہا نصیب
تجھ کو گدائے راہگذر دیکھتے تو ہیں

دامانِ لطف غیر پہ ہے غیر پہ رہے،
مجھ کو یہ کم نہیں وُہ اِدھر دیکھتے تو ہیں

آنکھوں کو پھر یہ اشک بھی شاید نہ ہوں نصیب
رو رو کے مجھ کو وقتِ سفر دیکھتے تو ہیں

مایُوسیوں نے لُوٹ لئے خوابِ آرزو
اُٹھ اُٹھ کے پھر بھی جانبِ در دیکھتے تو ہیں

کیا کم ہے یہ عنایتِ کیفِ نگاہِ دوست
ہم جس طرف ہیں لوگ اُدھر دیکھتے تو ہیں

کلیم عثمانی

رات کی زلفیں بھیگی بھیگی اور عالم تنہائی کا
کتنے درد جگا دیتا ہے اِک جھونکا پروائی کا

کب سے نہ جانے گلیوں گلیوں سائے کی صورت پھرتے ہیں
کِس سے دل کی بات کریں ہم شہر ہے اُس ہرجائی کا

عشق ہماری بربادی کو دِل سے دُعائیں دیتا ہے
ہم سے پہلے اتنا روشن نام نہ تھا رُسوائی کا

ساحل و طوفاں کے افسانے دُور ہیں غم کی حقیقت سے
ڈُوب کے اُبھرو تو عرفاں ہو دریا کی گہرائی کا

اپنے غم کی جوت بڑھائی دُنیا کی غمخواری میں
برسوں ہم نے دشت جنوں میں کام کیا دانائی کا

تم ہو کلیم عجیب دیوانے بات انوکھی کرتے ہو
چاہ کا بھی ارمان ہو دل میں خوف بھی ہو رُسوائی کا

یہ دُکھ جاتا نہیں ہے اپنے جی سے
کبھی ہم کو ملے کوئی خوشی سے

تعجّب ہے کہ پھر بھی جی رہے ہیں
ملا کچھ بھی نہ ہم کو زندگی سے

لگا تہمت نہ کوئی بجلیوں پر
جلایا آشیاں ہم نے خوشی سے

وہاں لے چل ہمیں اے دِل جہاں پر
لگن ہے آدمی کو آدمی سے

یہاں کوئی نہیں گلزار اپنا
نظر آتے ہیں سارے اجنبی سے

نظر امروہی

○

جی کھول کے ہنسے کبھی جی بھر کے رو لیئے
جتنے بھی دِل میں داغِ تمنّا تھے دھو لیئے

رخسارِ گل پہ قطرۂ شبنم کو دیکھکر
پلکوں نے تیری یاد کے موتی پرو لیئے

پڑ جائیں گے کچھ اور بھی پردے نگاہ پر
اہلِ خرد پہ رازِ محبت نہ کھو لیئے

جوشِ جنوں میں اور تو ہم کچھ نہ کر سکے
اپنے ہی ہاتھ اپنے لہو میں ڈبو لیئے

طاری حریمِ گل پہ ہے اک عالمِ سکوت
اے ساکنانِ صحنِ چمن کچھ تو بولیئے

ہم امتیازِ رہبر و رہزن نہ کر سکے
راہِ وفا میں جو بھی ملا ساتھ ہو لیئے

کھلنے لگی ہے شب کے اندھیروں میں روشنی
اُٹھو نظر کہ اب تو بہت دیر سو لیئے

○

بشارت احمد جمیل
بی، اے۔ سال دوم

○

گو تابِ تکلّم نہیں آنکھوں سے عیاں ہے
وُہ دردِ محبّت جو میرے دِل میں نہاں ہے
آئی ہے شبِ ہجر قیامت کا سماں ہے
اے چارہ گرو دستِ اجل آج کہاں ہے
ماضی کی حسیں یاد کے افسانے نہ چھیڑو
وُہ عہدِ گذشتہ بھی تو اک بارِ گراں ہے
اِک دورِ بہاراں تو گذارا ہے خوشی سے
پھر عہدِ خزاں آیا وُہی آہ و فغاں ہے
حیرت ہے وُہ کہتے ہیں کہ دِل جلتا ہے کیونکر
حیرت ہے کہ دِل پھر بھی مرا شعلہ بجاں ہے
زنجیر کو توڑا ہے اِسی جوشِ جنوں نے
جس پر کہ تیرا دامِ محبّت بھی گراں ہے
اے کوچۂ جاناں کا پتہ پُوچھنے والو!
دِل ہی میں اِسے ڈھونڈو یہی اس کا مکاں ہے
نظروں میں جمیلؔ اُن کی عجب سحر بھرا ہے
اک بار نظر اُٹھے تو پھر کون کہاں ہے

○

سعادت علی سیّد
اولڈ بوائے

○

نین ہنسائیں نین رُلائیں — من کی نگری نین بسائیں
نین کے ڈورے نین کے بندھن — نین نینوں میں گھرتے جائیں

نین بنائیں پریت کی راہیں — قدم قدم پہ بچھتے جائیں
من میں پی کی جوت جگا کر — پلک پلک پر دیپ جلائیں

من کی گھور پہ نیناں برسیں — گنگا جمنا نیر بہائیں
نین رہے نینوں کے پیاسے — جیون امرت گھول پلائیں

نینوں سے انگارے پھوٹیں — کھلتے گلشن راکھ بنائیں
صحرا صحرا پھول کھلائیں — گلشن گلشن دھول اُڑائیں

مَیں پاپن کے نین بیچارے — اُس شیتل کے نین نیارے
یہ رِم جھم برکھا برسائیں — وُہ جل تھل میں آگ لگائیں

○

مُبارک احمد عابد

ڈھلنے لگا سُورج تو بڑھے شام کے سائے
تم ایسے گئے ہو کہ نہیں لوٹ کے آئے

یارب! یہ شبِ ہجر تو کاٹے نہیں کٹتی
بہتا ہے لہو آنکھ سے اشکوں کی بجائے

خاموش نگاہوں میں ہے اظہارِ تمنّا
آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں طوفان چھپائے

روشن نہ ہُوا دِل کا سیہ خانہ کسی طرح
کب تک کوئی آشا کے چراغوں کو جلائے

آنسو سے بڑا کوئی مُصوّر نہیں عابد
جو خُون سے جذبات کی تصویر بنائے

عبد الرشید قریشی

کیسے ہوا کلی کو چٹکنے کا اشتیاق
بے عندلیب باغ میں گل کا نکھار کیا

بلبل اگر ہو صحنِ گلستاں سے دور تر
پھر گلستاں کا حسن کیا اسکی بہار کیا

قدسی نے بڑھ کے تھام لیا دامنِ قمر
اب میرا اضطراب کیا میری پُکار کیا

موتی بکھیرتے تھے وہ عرفانِ یار کے
احسان اور لطف کا اُن کے شمار کیا

اے دِل تو انکی رسمِ محبّت کو عام کر
مہمان سرائے دہر کا ہے اعتبار کیا

نوٹ :- یہ اشعار حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر کہے گئے۔

مُبارک احمد عآبد

ڈھلنے لگا سُورج تو بڑھے شام کے سائے
تم ایسے گئے ہو کہ نہیں لوٹ کے آئے

یارب! یہ شبِ ہجر تو کاٹے نہیں کٹتی
بہتا ہے لہو آنکھ سے اشکوں کی بجائے

خاموش نگاہوں میں ہے اظہارِ تمنّا
آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں طوفان چھپائے

روشن نہ ہُوا دِل کا سیہ خانہ کسی طرح
کب تک کوئی آشا کے چراغوں کو جلائے

آنسو سے بڑا کوئی مُصوّر نہیں عآبد
جو خُون سے جذبات کی تصویر بنائے

عبد الرشید قریشی

کیسے ہوا کلی کو چٹکنے کا اشتیاق
بے عندلیب باغ میں گل کا نکھار کیا

بلبل اگر ہو صحنِ گلستاں سے دور تر
پھر گلستاں کا حسن کیا اسکی بہار کیا

قدسی نے بڑھ کے تھام لیا دامنِ قمر
اب میرا اضطراب کیا میری پُکار کیا

موتی بکھیرتے تھے وہ عرفانِ یار کے
احسان اور لطف کا اُن کے شمار کیا

اے دِل تو انکی رسمِ محبّت کو عام کر
مہمان سرائے دہر کا ہے اعتبار کیا

نوٹ :- یہ اشعار حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی رضؓ کی وفات پر کہے گئے۔

لطیف گجراتی

○

اہلِ قفس جب باغ میں جائیں
پھُول پھُول میں آگ جلائیں،

چُپکے سے وُہ دل میں آئیں
میری سُنیں کچھ اپنی سُنائیں

کلیوں کو بھی آنکھیں اُن کی
کھِلنے کے آداب سکھائیں

کوئی کہے یہ اُن سے جاکر
اب سے مجھے وہ یاد نہ آئیں

البیلی یادوں کے سائے
بھاگیں، دوڑیں، ہاتھ نہ آئیں

پت جھڑ کے دو سوکھے پات
گلشن کے سب راز بتائیں

پھر گلشن میں آئی بہار
آؤ لطیف کو بن سے بلائیں

لطیف گجراتی

○

آئی ہے رات حسرتوں کا رُوپ دھار کے
پھیلیں گے اور سلسلے اب زُلفِ یار کے

وہ آگئے ہیں اِس طرح زُلفیں سنوار کے
اُترے ہوں جیسے قافلے ابرِ بہار کے

سب جُرم جل کے خاک ہوئے خاکسار کے
یہ معجزے ہیں میری فغاں کے شرار کے

جب سے جلے چراغ غمِ ہجر یار کے
سب بُجھ گئے ہیں جتنے تھے غم روزگار کے

جو اُٹھ رہے ہیں شعلے میرے دِل سے پیار کے
اُن کو نہ تم بجھا سکو گے پھُونک مار کے

٭

محمد اقبال رانجھا

کوئی ایک بار روئے کوئی بار بار روئے

اِس زندگی کے ہاتھوں ہم بے شمار روئے

واللہ بے نیازی! اُمّید بھی سزا ہے

کوئی کیسے مُسکرائے کوئی کس طرح نہ روئے

دل کی گلابیاں بھی معدوم ہو چلی ہیں

کِس کو کہوں جو کوئی یہ داغ آ کے دھوئے

وہ جانِ حسن و خوبی محفل میں منتظر ہے

تم لوگ پھر رہے ہو جنگل میں کھوئے کھوئے

ہم آجتک نہ سمجھے طوفان کی ادا کو

منجدھار سے بچا لے، ساحل پہ جا ڈبوئے

اقبال جی رہے ہیں اس یار کے بہانے

جس یار کی تڑپ میں ہم آجتک نہ سوئے

قمر کاشمیری

کیا گلہ تم سے اگر وعدہ نبھایا نہ گیا

ہم سے بھی تیری جفاؤں کو بھلایا نہ گیا

بزم کو میری سجاتے ہیں ستارے بے کار

یہ ہے وہ بزم جہاں نہ کوئی آیا نہ گیا

عشق کا دعویٰ تو کر بیٹھے تیرے دیوانے

ناتواں کندھوں سے یہ بوجھ اُٹھایا نہ گیا

یُونہی کہتے تھے مٹا دینگے محبت کے نقوش

نقش ہم سے تو جفا کا بھی مٹایا نہ گیا

ہم اسے عاشقِ صادق نہیں کہتے ہرگز

جو تیری آتشِ فُرقت میں جلایا نہ گیا

تم یہ کہتے ہو ہمیں رونے کی عادت ہے قمر

تم سے روکا نہ گیا؟ تم سے ہنسایا نہ گیا

AL-MANAR

JAN., TO JUNE

1965

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College

RABWAH

Jan. to June 1965

(Annual Number)

Staff Incharge

HAMID AHMAD CHAUDHRY M.A.

Editors

RIFATULLAH KHAN
NAEEM OZMAAN
LATIF AHMAD

CONTENTS

			Pages
1.	Editorial		1
2.	Religion and Science	*Rifatullah Khan*	3
3.	Man and the Universe	*Abdul Jalil Sadiq M.A.*	7
4.	Mankinds Golden Rule	*Ahya-ud-Din*	13
5.	Disturbance in Class Room	*A.R. Junaid Hashmi*	14
6.	International Trade	*Zafar A. V. M.A.*	18
7.	Bright Star	*Rifatullah Khan*	30
8.	Teddy (an element)	*Intisar Mohar*	31
9.	Fall of the Leaf	*Shamshad Ali Syed*	34
10.	Mawalimu	*Naeem Ozmaan*	35
11.	The Role of Muslims in Botany	*Abdus Shakoor Aslam M.Sc.*	48
12.	A. Glimpse of College Life	*Observer*	56
13.	Let us Define		62
14.	Making the Best of Thing	*Muhammad Zakria*	63
15.	Beautiful Flower	*Karim Qamar*	66
16.	The Day We were Fooled	*Tahir Qazi*	67
17.	Strange Experience	*Khalilur Rahman*	71
18.	A. Quiz	*Rifatullah Khan*	74
19.	Believe it or Not.	*Naseer Ahmad*	76
20.	Modern Yoth	*Naeem Ozmaan*	81
21.	Greatest Example of Endurance	*MunawarA hmad Malik*	85
22.	و اوحی ربك الی النحل	قریشی مقبول احمد	87
23.	لسان الغتی نصف	رضیه درد	90
24.	فاکهة الفکاهات	عطاء المجیب راشد	92

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and Published by A. R. Junaid Hashmi for Talim-ul-Islam College, Rabwah.

AL-MANAR EDITORIAL BOARD

Chairs (*L to R*) M A. Khalid M.A (Incharge Urdu Section); Ata-ul-Mujeeb Rashed (*Chief Editor Urdu Sec.*)
Sahibzada Mirza Nasir Ahmad M.A. (Oxon) *Principal* ;
Rifatullah Khan (*Chief Editor Eng. Sec.*) ; Ch. Hamid Ahmad M.A. (*Incharge Eng. Sec.*).

Standing (*L to R*) Mubarak Ahmad Abed (*Editor*) ; Shamshad Ali Syed (*Editor*).

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

Vol XIV	Jan., to June 1965	No. 1

Editorial

The deciphering and unfoldment of an intellectual treasure is the supreme quest of education. Reading text-book is rather one of variegated means to that end. The publication of this magazine is yet another important means to achieve it. As the literary forum of our College, it is directed to creation of an atomsphere conducive to the flowering and fostering of the literary genius of the students. Herein are brought to the fore the creative talents of the students in the realm of art and literature, and put on road to develop and blossom.

But publishing a College magazine is entirely a different affair than publishing any other magazine, journal or periodical. In the case of the former it is a continuous pursuation and encouragement which has to be meted out to the student off and on to contribute articles of the nature of educational essays, short stories, tit bits and poems. These amateur writers though possess talent and capacity yet are always too shy to give vent to their creative powers.

Thus to enhance the zest and interest of the students for article contribution an "Article Competition" was held for English section, but the result was not as encouraging as we expected. Articles other than contribued by the members of the staff and editorial board were not up to the mark. Therefore no prize is being given this time. But the competition is still open for the next issue.

However, this time our section has made forward strides and shown considerable improvement. In this issue the reader will find literary art in all its varieties—essays, short story, poems and play—something of every thing. But a word of caution to an over optimistic reader. He must not forget that our contributors are just budding artists and their work must be judged as such. Will it not be unreasonable and fallacious to expect it to reach the philosophical heights of Bertrand Russell? No wonder, too, if the reader should find it's poems and plays lacking the Shakesperean touch. Yet it should be all the more encouraging that it certainly does not lack the basic qualities.

Rifatullah Khan IV year

Religion Vs Science

And when it is said to them:
"Believe as other men have believed"; They say,
"Shall we believe as the fools have believed ?" Is
it not that they are themselves the fools ? But they
know it not !" (I, Sura II)

What is now happening in our Muslim Society has never happened before. It has never before happened that rich, ruling and more educated minority, which has the most influence on the masses, have not only disbelieved the existing religion, but are convinced that no religion at all is any longer needed. Instead of influencing those who are doubtful of the truth of the generally professed religion to accept some religious teaching more rational, more clear than the prevalent one, has influenced them to regard religion in general as a thing that has outlived its day and is now not only a useless, but even a harmful social organ like the Vermiform appendix in the human body.

Religion is regarded by such men not as something known to us, but as an external phenomenon, a disease.

Religion in the opinion of some of the learned men, "Arose from attributing a spirit to various aspects of Nature (animism)"; in the opinion of others, "It arose from the supposed possibility of communicating with deceased ancestors." In the opinion of others again it arose "from fear of the forces of Nature".

To them the day of religion has passed and religion must now be replaced by Science. In the opinion of these learned men there was a period of ignorance—the religious period that has long been outlived by humanity. They think that Science should and can replace religion and which has even already replaced it. "Religion is obsolete belief in anything but Science is ignorance. Science will arrange all that is needful and one must be guided in life by science alone." This is what is thought and said both by scientists themselves and ,also by those who, far from science, believe in the scientists and join hands with them in asserting that religion is obsolete superstition and that we must be guided in life by Science alone.

These people have decided that religion is not wanted and that science will replace it or has already done so. We cannot compell them to believe in what we believe as

"Let there be no compulsion in Religion."

(I, Sura II)

But the fact remains that now as formerly no human Society and no rational man has existed or can exist without a religion. I use the term 'rational man' because an irrational man may live, as the beasts do, without a religion. But a rational man cannot live without one, for only religion gives a rational man a guidance he needs, telling him what he should do and what first and what next. A rational man cannot live without a religion precisely because reason is characteristic of his nature. Every animal is guided in its actions by a consideration of direct results of its actions. Having considered those results by such means of comprehension, as it possesses, an animal makes its actions confirm to those consequences and it always unhasitatingly acts in one and the

same way in accordance with those considerations.

A bee, for instance, flies for honey and stores it in the hive because in winter it will need food for itself and for the young, and beyond these consideration it knows and can know nothing. So also birds are influenced when they build their nest or migrate from place to place. Every animal acts in a like way when it does anything not resulting from direct, immediate necessity but prompted by considerations of anticipated results. The difference between a man and an animal lies in the fact that the perceptive capacities possessed by animal are limited to what we call instinct, whereas man's fundamental perceptive capacity is reason; A bee collecting honey can have no doubts as to whether it is good or bad to collect honey, but man gathering his corn or fruit cannot but consider whether diminishing the prospects of obtaining harvest and whether he is not depriving his neighbour of food. How can he help wondering what the children whom he now feeds will grow up. Every rational man knows or at least feels that in most important questions of life he can guide himself neither by considerations of immediate consequences of his activity—for the consequences that he foresees are numerous and multiple, which sometimes are contradictory to one another. They may prove harmful to him while he thinks them as beneficial. A reasonable man cannot decide any of the most important questions of life by considerations of their immediate results, and consequences. A reasonable man cannot be satisfied with the considerations that guide the actions of an animal. A man may regard himself animal among animals or he may consider himself as a member of a family, a society or a nation, living for centuries, or he may and even must consider himself as part of the whole infinite universe existing eternally. And therefore reasonable man should do, and always have done in

reference to the infinitely small affairs of their life affecting their actions, what in mathematics is called integrate. That is to say they must set up beside their relation to the immediate facts of life, a relation to the whole of the immense infinite in time and space conceived as one whole. And such establishment of man's relation to that whole of which he feels himself to be a part, from which he draws guidance for his actions, is what has been called and is called Religion. And therefore religion always has been, and cannot cease to be, a necessary and indispensable condition of the life of a reasonable man and of all reasonable humanity.

> How can you withhold faith from God?
> Ye were dead and He gave you life; next He will cause you to die; next He will restore you to life; next shall you return to Him.

Do what thy manhood bids thee do, from none but
self respect applauses;
He noblest lives and noblest dies who makes and
keeps his self-made laws;
All other life is living death, world where now
but phantoms dwell;
A breath, a wind, a sound, a voice, a tinkling
of the camel-bell

(*Cameons*)

Abdul Jalil Sadiq M.A.

Man and the Universe

*Man affects the Universe, Universe affects man. At the outset, it may appear a paradox but it is a fact which soundminded and enlightened may perceive. Man is a part of the whole Universe: But contrary to this assertion Universe is for man. Many have thought about it and many more may think like this, but few have the faith and intelligence enough to realize this reality. To a Muslim particularly, the saying of Holy Prophet (peace and blessings of God be on him) "لولاك لما خلقت الافلاک" is a sufficient testimony to this effect. No doubt, here the ideal Man or the greatest of Mankind is argumented. This conception may not be regarded as a mere freak of fancy or just to induce quietism. On the other hand it is the reality of the facts of life. The Holy Quran exposes this interdependence in a suitable way by frequently stressing on the thorough, concrete and creative research over the motion of heavenly bodies; the route and passages of their revolutionary motion and as a result their effects and consequences. Holy Quran reads thus :

و سخر لكم الشمس و القمر.....الخ

انا زينا السماء الدنيا بزينة الكوكب ان فى خلق السموات

و الارض و اختلاف الليل و النهار لايات لا ولى الالباب

In these verses, and in many more it has been strongly and emphatically maintained that the planetary motion, the Nature of Universe, the various changes, etc. have correspond-

*Here such Divines are especially considered who, with their piety and Prophetic zeal, can bring about miraculous changes.

ing relation with the spiritual bodies. In fact the analogy between the material and the spiritual bodies is more than an anology, because both are based on the same line, the datum line for any process for both remains the same. In other words, analytical study for one will automatically lead to the same analysis for the other.

Having established their mutual identity and indispensibility, let us go in detail about their salient features and irreproachable similarity.

Material Bodies :—

Starting from the simplest particle of matter, i.e. atom, we find that the nature of motion in the atom is, that sub-particles of atom, electrons, etc, have an inherent tendency to revolve round the nucleus, which is the centre.

Moreover, these particles remain in constant motion. Extending this form of motion to higher ones, similar type of motion is generally in vogue. The higher bodies exhibit in a more vivid form. Different planets including the earth are constantly moving round the sun thus forming a galaxy. Our galaxy along with many others of this type is further revolving round another solar body, and so as a result form a supergalaxy. Supergalaxies again revolve round another central pivot and manifest the same type of motion. The man of today, so to speak, with his extensive knowledge and bounty resources reaches upto this extent. He fails to bring the further movements under his sway of knowledge. Nevertheless, it remains an acknowledged fact, that the nature of motion remains the same.

We cannot proceed any more without mentioning the point that without the existence of nucleus or centre we cannot think of these sub-particles, which are, as latter

affirmed, "dragged ones of the nucleus".

In other words, the central body is a gurantee for their existence. What to speak of the altogether absence of the centre, we see, a mere displacement of the Centre of Gravity brings about the collapse.

Now that it has been established that the nature of motion on the material side remains of nuclear fashion, we proceed to the spiritual side, which is beyond any doubt, the corollary and at the same time the immediate and lucrative concern of this topic.

Spiritual Bodies :-

"With the advent of the Holy Prophet (peace and blessing of God be up on him) the religion of God was completed and finalised"—is not a mere verbal or feigned statement; but this saying of Holy Quran possesses, the whole History of Islam, its origion, its accomplishment and destiny, and above all the transitional phases. For a Muslim particularly Al-mighty chose Islam for Mankind. Its implementation was made with the advent of human race, its completion with the Holy Prophet, as he being the greatest of mankind and superior most to all the prophets; its preservation and revival for the later decades. In this way the Hellinistic, Roman, Persian and Turkish cultures were rather the ramified aspects of Islam than the formers having any influence over the later. It is also equally unreal to suppose, as Iqbal did that Islam emerged as a result of the continuous struggle with Roman and Hellinistic cultures. To be more precise, Islam served as a nucleus around which the other civilisations and cultures revolved having a centripetal tendency. That is why the sayings of Holy Prophet (peace and blessings of God be on him) الحكمة ضالة المومن, is a testimony for this nuclear presentation which means, "Every Truth is

an inherited property of a Muslim" In other words, every Muslim's endeavour for truth, from wherever quarters can it be achieved is what the Islam stands for, its further significance lays in so for the other civilisatione and cultures were subsidiary and driving aspects of Islam, operating under different circumstances in different soils and producing different results.

Before bringing to light the essential identity between the material and the spiritual bodies, we try to discover the aim of the prophets and the nature of their very existence. Man is endowed with latent and Gained Intellects as Farabi, many centuries in the past also held. When these Intellects are purified and refined by external pilutions and every kind of superficial covering is removed, the man's intellect becomes receptive of the Active Intellect, the revelation or "wahy." This is to some extent the instinctive state to which Holy Prophet has remarked :

كل مولود يولد على فطرة الاسلام

And to a great extent the point to which Holy Quran's ارجعى الى ربك راضة مرضية give the reference. Or this verse دلى فتدلى فكان قاب قوسين اوادنى fully comprehends it albeit it is an irreproachable expression for the highest perfection of the greatest man.

The point to be noted here is, that the fusion is between a man's soul and God's Emantion, and not the superb fusion of the inner ones only, as Iqbal and many others have held. It is both biologically false and empirically inadequate. But the most important point which is by no means any concession, that it is God's Omniscence which reveals the purified stage. These verses

لايكلف الله نفس الا وسعها

confirm this blessing to the chosen few. So that it becomes unequivocally unique and yet at the same time demonstrative and rational. From the established principle of centripetal tendency on the spiritual side in the lower forms, we take into account the "prophetic motion" as equivalent to and corresponding with the planetary motion of the heavenly or material bodies. Same type of inherent tendency on the spiritual side too, is manifested and definitely in a more glaring form. The Holy Prophet (peace and blessings of God be on him) the greatest of mankind and superior most to all the prophets, serves as a nucleus or pivot round that all the "planets" revolved, revolve and no doubt, will go on revolving. Without the presence of Holy Prophet there would have been no prophets—no Universe, as the afore-mentioned Hadith (Qudsi)

لولاك لما خلقت الافلاك

gives an indispensibility.

Before the advent of Holy Prophet, we find such planets or prophets revolving and moving round the nucleus or the centre or the Holy Prophet (peace and blessings of God be on him). But now the question arises about the other portion of the circle. How can the orbit be complete and motion be regular and concise, if we ignore the other planets or prophets after the Holy Prophet? Can we have one principle for matter, another for spirit, or one for the body and another for the soul? Should we discard the other because that does not reconcile with the former? Either we have to shake off and abandon the principle altogether, or to manipulate another for the spirit for soul and for spiritual life. Both these assumptions are as illogical as false. The logic of the facts and empirical observation with staunch scientific approach, demands, that the orbit and motion will be incomplete— or there will

be no motion at all, unless, we expressly or tacitly beleive that such "planets" or prophets after the Holy prophet are an unavoidable necessity. This is the demand of reason, the fact of history and the rigour of logic.

KNOWLEDGE

There are four sorts of men :

He who knows not and knows not he knows not
He is a fool———shun him ;

He who knows not and knows he knows not
He is simple———teach him;

He who knows and knows not he knows :
He is asleep———awake him.

He who knows and knows he knows :
He is wise———follow him.

(*Lady Buston*)

Mankinds Golden Rule

Through the scriptures of Seven of the world's leading religions runs a single theme, expressed in astionishingly similar form :

1. Brahmanism : This is the sum of duty : Do naught unto others which would cause you pain if done to you.

2. Budhism : Hurt not others in ways that you yourself would find hurtful.

3. Confucianism : Is there one maxim which ought to be acted upon throughout one's whole life? Surely it is the maxim of loving kindness : Do not unto others what you would not have them do unto you.

4. Taoism : Regard your neighbours's gain as your own gain, and your neighbour's loss as your own loss.

5. Judism : What is hateful to you, do not to your fellow man. That is the entire Law ; All the rest is commentary.

6. Christianity : All things whatsover ye would that men should do to you, do ye even so to them for this is the law of the prophets.

7. Islam : No one of you is a believer until he desires for his brother that which he desires for himself.'

A. R. Junaid Hashmi

Disturbance in Class Room

We had just assembled in the class-room, and like busy-bees were searching for cozy cells to hear our History lecturer... amiably known as *Professor Nightingale*. His source of popularity and success was, besides the sweetness of his personality, the nightingale's "full-throated ease" with which he "poured his full heart in profuse strains of unpremediated art". When he told us "stories of the past" the whole class listened spell-bound and enthralled. It was not very important what he said, but it was *the way* he said. Immaculately dressed, with artistic antics of his hands and swaying of his torso to and fro, he could spell jugglery of words to ensnare his audience. He had no stock of scholarship or amount of research work to his credit but strangely with pantherlike grace of movements and a trained command of gesture he could bewitch his audience with beautiful nonsense. There was a hypnotic appeal in his voice, which could entertain and attract the lazy mind of a student prone to shun strenuous intellectual effort.

Soon the professor brushed in, opened his brief case, brought out his file of notes, opened his attendance register, and began to rattle off the roll-numbers. It took fifteen minutes. Everybody was present including proxies of-course. Then he began his discourse; while the pupils were in no mood to hear him that day. He began:

"Eighteenth century was a period of adventures. Countless Men-of-Sword and Destiny carried fire and destruction throughtout the world. From one end of this vast world to

the antipods of this Earth, adventurers, men of fortune, toppled over the thrones and crowns of mighty kings and emperors. If in America, Washington was riding at the head of Victorious hordes of Independence, in Europe Nepolean the great was knocking at the very gates of Moscow, after crumpling to dust the crests of haughty Dukes and Princes. India did not lag behind, in the share of men of Destiny and powerful sons-of-fate and fortune. In the North....."

Suddenly, a voice rang out and then floated over eardrums full of appeal and compassion:

"Sir! He is poking me from behind!" The professor's voice abruptly, first became a bable of meaningless words, then hushed to nothingness. In complete silence, all eyes were instantly reverted and rivetted to the spotless rumpy back of a young lad who had stood up in the front row, as if by an electric shock. The following minutes were a torture, each minute seemed an-eternity, time stood still. At last the professor walked towards the flushed-cheeked complainer and burst forth a barrage of enquires without giving him any chance of explanation.

"What did he do? Who did it? With what instrument he committed this act? Where is the culprit now? And are you hurt?"

The innocent young lad did not answer. He only covered his large tearful eyes and sobbed and sighed under the cover of his plump-hands. The Professor of course, could not find out the instrument--a pencil—as it had already travelled from hand to hand underneath to the labyrinths of back-benches.

Again the Professor's lecture began:

"So I was telling you that eighteenth Century

was a period of adventurers. Man of Fortune were born in almost every country of our Mother Earth. In India, too, in the North, the vast plain of Panipat was trampled under the hoofs of the horses of Ahmad Shah Abdali on one side and on the other Balaji-Baji Rao the mighty *peshwa* was looting and routing the ramnants of mighty Mughal armies in Central Asia. Tippu Sultan.....,"

"Sir, somebody has flung this paper-ball at my shaved head!"

All of a sudden, a burst of laughter rang through the room, the history of the past vanished in a jiffy, and instead eyes were feasting on the shiny skull of one of our popular friends. Only a day before he had a beautiful tuft of hair waving on his round head, but he had now shaved his skull clean like a polished ivory-table. We knew him as a tidy and teddy sort of a youngman. He often stimulated the aeshetic instincts of fellows. Now the subconscious conflict of exhibitionism had flared him to lay bare his round smooth billiard-top surface in a sudden fit. His inner urge told him that somebody should pass his hand slowly over the soft, delicate, *skin of his* symbol, with eyes turned supplicatingling to heaven. Of-course, the interrupted Professor seemed to be allergic to the light-headed feeling of gay abandon of the boy and made him sit down, and after wasting further fifteen minuses he again resumed his discourse. But the student were not in a mood to give him ears. He began:

"Well, I was telling you, gentlemen, that Eighteenth Century was a period of Adventure. If Tippu Sultan and Sirajud Daula were the product of this century, Mahabundoola in

Burma had manufactured chains of gold to arrest Lord Warren Hastings..."

A crash—a jumble of babblings and then some epileptic pranks were witnessed among the mid-benches. Somebody had fainted with an unknown fit. Friends and sympathisers had already crowded round the seemingly half-dead body of a teenager. Soon a body-builder sort of a friend began to give a hard massage to the tender *limbs* of the object. He had turned his white skin to purple-red with his brisk and hard rubbing. The Professor was nonplused and confused and couldn't arrive at anything nor could reach the patient. He was making verbal inquiries while hovering about the tight-circle created by the boys. He was told ghostly and prepostrous stories about the accident. Everybody was telling different versions about what had happend. The bell had gone", some were shouting. "The time is up". Some were saying: "the bell had not gone!" There was all confusion and chaos. The apparently motionless and pale body of the youngman, atlast tenderly lifted by willing hands, and carefully carried on arms, was taken outside the room and then whisked away. The lecture was abruptly stopped and we dispersed one by one.

All the show was farce, cleverly conspired and deliberately acted, to have a jolly time wasted in amusement.

Reading maketh a full man,
Conference a ready man and
writing an exact man.

(*Bacon*)

Zafar Ahmad Vaince

International Trade and Development

(We are grateful to Mr. Zafar Ahmad Vaince forhaving permitted us to publish this article which he read at the International Students Forum held at Geneva under the auspices of the United Nations Organization.[1] *Mr. Zafar, a lecturer of our College, is currently working for his Ph.D. in the University of London—Editor)*

It goes without saying that trade in a developing country is quite different from that of an already developed one. A "developing country" would require a particular pattern of its foreign trade at least in the initial phase of development, because the problems of foreign trade are different for different countries depending upon the supply of domestic resources, the stage of development, and the rate of growth of each individual country. A 'developing country' like Pakistan is essentially a primary producing country where a large portion of the national income is derived from agriculture and the exports of these primary products constitute the major source of its foreign exchange earnings on which mainly, if not solely depends the development.

Foreign trade has special importance and has some common problems in the developing countries and the dicisive efforts of underdeveloped countries to achieve planned economic development have added a new dimension to their external trade problems. This is despite the fact that foreign trade constitutes different proportion of the national income in different countries. The ratio of imports to real product in the primary producing countries varied for example from about 5% for India and 6% for Pakistan to 47 percent for

1 For lack of space the article is being published in two instalments.

Malaya during the period 1953-55. Similarly the proportion of exports in the national income varied from 6 percent for India and 7 percent for Pakistan to 33 percent for Malaya during the same period.

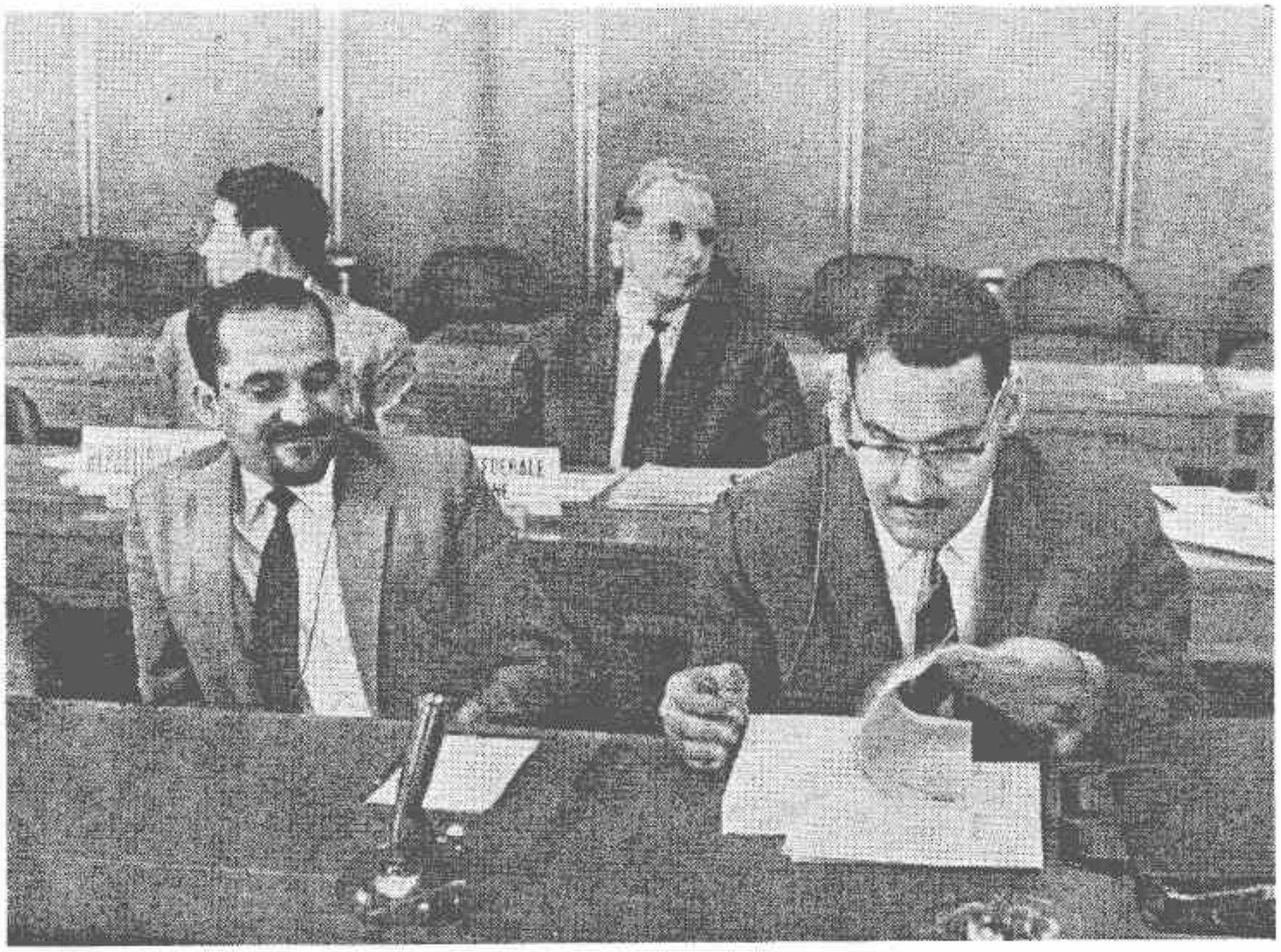

Mr. Zafar Ahmad Vaince attending the United Nations Student's Interne Programme 1964 at which he read this article.

Yet foreign trade is playing a vital part in all these countries in so far as export earnings have conditioned the growth of their economies and because their external balances have been heavily dependent on factors outside

their control. The importance of favourable international trade remains crucial because all newly developing countries are heavily dependent on imports of machinery, heavy equipment and other essential goods that are strategic to lifting the levels of productive investment for accelerated economic growth. Increased export earnings are thus vital to pay for the expanding needs of imported supplies.

MAIN FEATURES OF FOREIGN TRADE OF UNDER-DEVELOPED COUNTRIES.

Broadly speaking the main features of foreign trade of underdeveloped countries are as follows :

(a) Export consists mainly of food stuffs and raw material of Industrial production both agricultural and the range of export goods is very limited.

(b) Imports consist mainly of consumption goods and finished goods and partly of Capital goods, but along with the decisive efforts of economic developments, that share of capital goods is increasing while that of consumer goods declining, but inspite of this the share of consumer goods out of total imports remains fairely high.

(c) Imports are generally in excess of exports and the share of export trade is cotinuously falling.

(d) Proceeds from exports form a substantial portion of the domestic national product and as such national economy becomes dependent on external factors, especially export trade.

TRADING PATTERN

The trading pattern of the underdeveloped countries is such that they export, in the main, primary products

and import in return largely manufactured goods.

The primary products comprising foodstuffs, agricultural raw materials, ores and fuel, account for well over four fifths of the total exports of the underdeveloped countries, while over 60 percent of the imports consist of manufactured goods and machinery.

LIMITED RANGE OF EXPORTS

The poor underdeveloped countries largely depend on the production for export of a single or a limited range of primary products.

How limited the range of exports is can be seen from the fact that 30 of them in 1958 depended on a single commodity for about 50 percent of their exports.

The table (1) below shows the list of countries with more than 50 percent of exports (by value) in a single commodity. Mauritius gets 99 percent of its export carnings from sugar alone. Similarly Egypt gets 70 percent of her expert earning from cotton, Ceylon €6 percent from tea and Pakistan 58 percent from raw Jute. Moreover, in most of these countries the ratio of exports to national products is high, which makes these economics susceptible to foreign external factors which are beyond their control.

Furthermore/the range of export goods is very limited. Malaya gets 83 percent from rubber and tin, Ceylon 80 percent from rubber and tea ; Thailand 75 percent from rice and rubber ; Pakistan 82 percent from raw cotton and Jute.

TABLE I.

Countries with more than 50 percent of exports (by value) in a single commodity, 1958.

Country	Commodity	Percentage of Exports in single commodity	Percentage of National Product Exported.
Maritius [1957]	Sugar	99	47
Netherland Anilles	Petroleum	99	—
Iraq	Petroleum	92	—
Venzueela	Petroleum	91	44
Columbia [1957]	Coffee	77	15
Cuba	Sugar	77	35
Burma	Rice	74	21
Haiti	Coffee	74	20
Elsalvado	Coffee	73	—
Guatemala	Coffee	73	21
Egypt	Cotton	70	14
Zanzibar	Cloves & Clove oil	68	—
Panama	Bananas	67	10
Ceylon	Tea	66	33
Ghana	Cocoa	66	32
Chile	Copper	63	16
Liberia	Rubber	62	—
Malaya	Rubber	62	—
Pakistan	Jute	58	7
Uruguay	Wool	58	—
Bolivia	Tin	57	—
Rhodesia and Nayasaland	Metals	57	35
Ecuador	Bannas	56	20
Ethiopia	Coffee	56	—

Sudan	Cotton	55	
China (Taiwan)	Sugar	52	14
Honduras [1957]	Bananas	51	22

The pattern of Pakistan's foreign trade is similar to that of many other underdeveloped countries. Two raw material exports—cotton and Jute, provided more than three fourths of the country's total exports by value in 1951 and together with the raw wool, tea, hides and skins bring this figure to over 90 percent.

FOREIGN TRADE AS A LAGGING FACTOR

In recent years, the export trade of the underdeveloped countries has not fared well in comparison with the trade of the advanced countries. (see table II)

In the nineteen fifties (1950-1960), the volume of exports from the less developed countries rose at an annual rate of 3.6 percent per annum as against a rate of growth of exports from the developed private economies not far short of twice as large and an expansion in the export volumes of the centrally planned economics almost three times as large under the momentum generated by the new programme or plans economic development launched in the nineteen fifties, on the other hand the annual increase in the volume of imports of the developing countries (4.6 percent) was significantly in excess of the 3.6% annual.

TABLE II

Percentage share of Non-Industrial Countries in the value of World Trade (a)

	Including Oil exporting countries.		Excluding Oil exporting coutnries.	
	1928	1957	1928	1957
Exports	33.8	31.3	32.2	24.4
Imports	28.0	35.0	26.9	30.4

(a) Excluding all Soviet area imports
(The 'figures for imports as well as exports are based on f.o.b values)

Expansion in the volume of exports. In parts, of course, this reflected the increased availibility of foreign loans and grants for accelerating their rate of economic advance. But it is also indication of the growing imbalance in their external accounts which is increasingly setting a limit to their plans for economic expansion.

TERMS OF TRADE

The lagging volume of exports is but one aspect of the critical problem encountered by the developed countries. In recent years, external balance has been considerably accentuated by a steady deterioration in the terms at which their exports are exchanged for imports.

A United Nation study has indicated that from the later part of the 19th century to the eve of the Second World War, there was a secular trend in the prices of the primary commodities exported by these countries, as a result at the end of this period a given quantity of primary export would, on the average pay for only 60 percent of the quantity of manufactured goods that it could buy at the beginning of the period.

Together, the lagging increase in their export volumes and the deterioration in their terms of trade led to a sus-stantionial decline in the share of underdeveloped areas in total world trade. The underdeveloped countries aocounted for somewhat less than one third of total world trade in 1950 but by 1960 their share had shrunk to one fifth. (See also take II).

The reasons for the trend towards external imbalance in the developing countries is mainly a manifestation of the disparity between the' rate growth of their primary products and that of their imports of industrial goods. While primary exports with certain exceptions, develop fairly slowly, demand for industrial imports tends to accelerate. This is a spontaneous feature of economic development.

The slow growth of primary exports is an inevitable result of technological progress, and leads to the increasing substitution of synthetics for natural products ; sand it is also reflected in one way or another in the smaller raw material content of finished goods

On the other hand, there are indirect consequences, since only a small part of the increased per capita income generated by teehnological progress goes into the demand for foodstuffs and other staple consumer goods, as compared to the demand for industrial goods and services which tends to rise rapidly.

The high levels of per capita income and consumption in the industrially advanced countries have transformed the whole structure of their demand for primary products. The demand for cereals and other foodstuffs has historically lagged behind the rise in incomes and the consumption of manufactured goods and of the products of service in industries. These

moreover, have been the significant increases in the domestic output of agricultural products in the developed countries.

Furthermore, the technological discoveries have led to spectacular growth in production of synthetic substitutes for several agricultural raw materials. It is under the combined weight of all these forces that the volume of exports from the underdeveloped countries has been expending slowly, that the prices of these exports have been deteriorating in relation to the prices of manufactured goods and that the share of the underdeveloped countries in total world trade has been declinning.

Another important factor which commonly aggravates the problem of price fluctuation in the typical products of the less develoded countries is that apparently by unlucky chance, rather than by inherent necessity, they are the victims of an unfortunate combination in the circumstances governing both the elasticity of their supply and of the demand for them. Accordingly if the demand changes there is little responsiveness on the supply side and the necessary adjustment to bring about a new balance of supply and demand is thrown back to the demand side.

The heart of the problem lies in the situation of certain relatively poor and underdeveloped countries largely dependent on the production for export of single primary product on a limited range of primary products. These products are sold in the main in 'free' markets that is, in condition giving the sellers no importance preferential position. They have been in recent years peculiarly liable to wide price fluctuations because of their exceptional inelasticities, of both supply and demand, their susceptibility to external factors

such as the psychology created by international tensions, and the variation in economic activity in the advanced industrial countries. Price fluctuations have in the main, though not always, been reflected in similar or wider fluctuations in export earnings and therefore in national income.

Both the prices and the volume of exports of less developed countries have been subject to wide fluctuations. The United Nations' study of the problem shows that during the period 1901 to 1950 the year to year price changes of 18 primary commodities which represent the major exports of 47 less developed countries averaged about 14 percent, fluctuations within the year averaged about 27 percent as between the high and low point of each year.

The year to year changes of export volume for the ample studied average between 18 to 19 percent. Excepting food stuffs, the volume and the prices of primary exports moved in the same direction. The fluctuations exports proceeds, therefore, tended to be still wilder. The secular trend seemed to be still rather towards wider price fluctuations such fluctuation make it very difficult for the less developed countries to have adequate control over fluctuations in their national income, money supply and the rate of growth.

In the nineteenth century, which saw the application on a large scale of the technological advances of the industrial revolution, rapid rate of increase, first in Western Europe and later in North America, called for rapid increase in the exports of primary products from the less developed parts of the world. This source of buoyancy however, no longer exists in the present day world.

It is now widely recognised that prospects for the underdeveloped countries major export commodities, consisting

primarily of primary commodities are not on the whole very promising. The circumstances, the stagnant demand, the prolectionist agricultural policy and the restrictive fiscal policy of the underdeveloped countries, major industerial buyers, have indicated decisively that export expension along traditional lines is limited. If hitherto, therefore, some comparative advantages for underdeveloped countries in exporting these commodities, changes in demand pattern from income growth, and advances in production methods resulting from technological improvements in the importing countries have apparaently more or less exhausted them.

In order to take advantage of the high income elasticities in the rapidly expanding economies of industerial areas, these countries, sooner or later have to follow Japanese path of industerialization by producing and even exporting manufactured goods.

For those countries which have abundant raw matreial it is only natural that the first step towards industrlilzation is to process or refine those agricultural and mineral materials so as to export them in a more refined form. In addition to the gain in export earnings from such a shift, it has advantages in raising domestic income and employment and also provides initial opportunities for training labourers in the new skills.

The late Prof. Nurku drew sharp distinction between the 19th and 20th centuries in terms of exports and growth. The nineteenth century pattern of economic growth through international trade was one in which outlying areas of the world economy were favoured by a rapidly expanding demand for their primary products. The expanding demand provided employment to labour and capital. It drew idle or dorment

resources into economic activity and attracted capital and labour from abroad. These circumstances no longer remain.

The twentieth century pattern of export expansion is one of "Industrialization for Export".

(To be continued in the next issue)

When friendship or love our sympathies move,
When the truth at a glance should appear,
The lips may be quiet in a dimpl or a smile
But the best of affection is a tear.

Rifatullah Khan
IV Year

Bright Star

(*Our beloved Principal*)

Sympathy, love, wisdom and grace,
All we can say in Mian Sahib's praise :
His personality's charm is entirely his own
With attractive appearance and melodious tone :
Wearing beautiful *sherwani* and turban he goes
Always as fresh as a lovely rose :
A distant glimpse of his magnetic sight,
Attracts our hearts with all his might:
He is the star of the staff and is so bright,
That to all of us it's a matter of pride.

CONVOCATION 1965

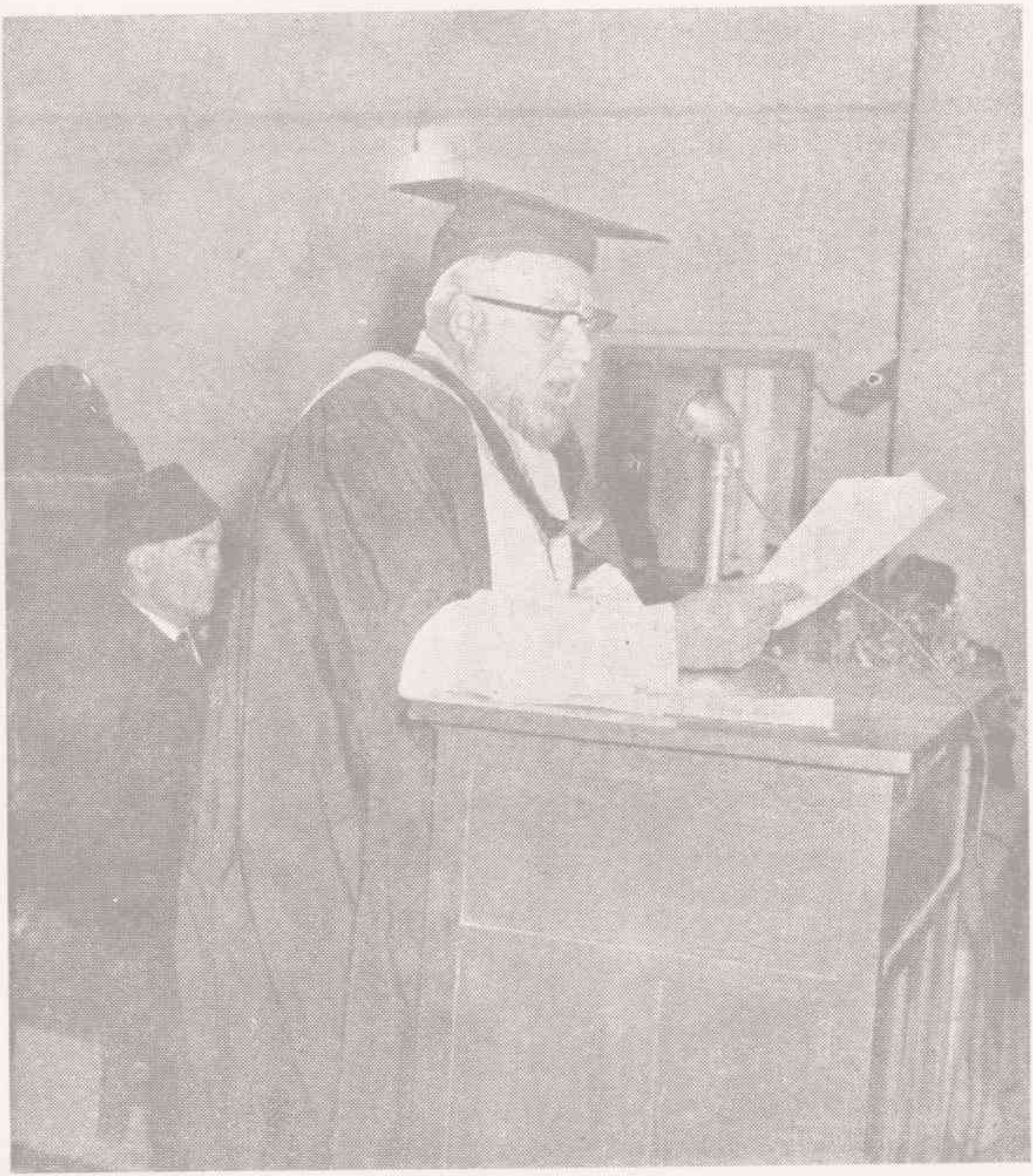

The Principal reading out the annual report at the convocation.

CONVOCATION 1965

Dr. Z. A. Hashmi Vice Chancellor Agricultural University Lyallpur delivering the convocation address.

Intsar Mohar

Teddy

(An Element)

History: We know nothing, how and in what conditions this important element was discovered. We are also helpless to name the 'Scientist', who discovered this element. Some people attribute this honour to a tailor, but we are not sure about it. The honour of its publicity goes to the film producers of Holly-wood. The simple and pure form of the 'substance', which we have in Pakistan, is also the result of the efforts of the film producers of Hollywood.

Occurence: This is present in almost every part of the world; in free state. This exists usually in cities, so we can call it, *The city loving element*. The major part of this element exists in colleges and schools.

Two forms of the elements.

This element is found in two different shapes. The physical properties of these two forms may be different but the chemical properties are the same.

The two forms are the following:

(1) Teddy Boy. (2) Teddy girl.

The important thing to note is that one molecule of the element posseses both the forms of atoms.

Atomic Structure of the First form.

Boots having long pointed notch ; tight pant and tight coat ; the nucleus. One atom of the first form.

Atomic Structure of the Second form :

Shoes having long pointed end ; tight '*Shalwar*' ; tight shirt and delicate nucleus, '*Dopatta*'. One atom of the second form.

As this form of the element has got a soft nucleus and an extra electron (*Dopatta*) in its non-nucleate portion, this is very reactive. Due to its reactionary nature the efforts are made to keep it away from the first form.

Preparation

It has been mentioned before that Hollywood films are responsible for its publicity. So these are the main reagent for its preparation. Fashion loving minds, after seeing the films, which are rich in its publicity are converted into teddies. Some times the preparation is brought about by action of one teddy, upon a fashion loving mind of another and the reaction taking place is the following.

Fashion loving mind —(effect of some teddy or film)= A Teddy.

Properties :

1. The element is of various colours.

2. It is a bit lighter. In other words when a fashion loving mind is converted into a teddy, its weight is reduced, due to the reduction of extra nuclear portion.

3. As the electrons in the extra nuclear portion are very tightly packed, it is very smart in nature.

4. This element is very distinctive in nature. In other

words it always wants to make distinction.

5. This is a panic loving element. The pure form of the element everywhere tries to create panic.

6. With police-man this reacts very badly, and as a result of this a very bad environment is produced.

Test :

This element is very easily recognized, because of its general physical appearance, so we need not remember any chemical test.

Uses :

I. By the use of this element smartness is produced in the new generation.

Disadvantages.

1. The major part of the element exists in colleges and schools. Due to its "panic loving property" the strikes are increasing in the country.

2. Due to its above property, some people use it for political purposes.

3. Due to its distinctive nature so many evils have spread in society.

Shamshad Ali Syed
IV Year

Fall of the Leaf

Ah ! these dying leaves !
They are burning———
These pale going leaves,
Against cold icy winds
For their quiet end,
They are yearning.
Leaves are like a heart,
A heart, a dying flower,
That wants to depart,
Like a falling star.
A time comes———
When no light
No hope, no life
No tears, no pain
No fairy hand,
But yellow sand
Flames———ashes———empty lane ;
And there it goes,
A dying flower,
A shooting star,
And people say———
Look !
This is the fall of the Leaf.

Naeem Ozmaan (African)
II Year

MWALIMU

THE GREATEST CHARACTER ALIVE

Mwalimu according to the Swahili dictitionary means teacher, and in the present age this title is confered upon the most respected and honoured person.

In this article, I will deal with the birth, life and doings of the greatest, the most respected, the most intellegent and spiritual man alive in this age, Mwalimu Hazrat Mirza Bashiruddin Mahmud Ahmad the present head of the Ahamadiyya Community.

It was during the days when the thought of God had utterly vanished from the minds of the people; the wild desire of pleasure seeking had captured the world; the blood of corruption ran in the veins of mankind; the dens of gambling, betting and music had become the abodes of worship; the word of God was being sacrificed at the alter of evil; giant waves of passion beat in everyone's heart and the worst of all, the complete sacred code of God, the religion of Islam was facing defeat from all sides. It was at this time that the Promised Messiah the Reformer of the present age and the Shield of Islam was directed by the Heavenly Father, to a small town, Hoshiarpur in the land of five rivers.

It was during these forty days of complete submission to the will of God that a Mighty Sign, was revealed to the

Promised Messiah (P.B.A.U.H.), a sign which was to link the past with the present and the present with the future and which was to usher a new era in the history of Islam and mankind.

This Sign gave glad tidings of the birth of an illustrious son to the Promised Messiah (P.B.A.U.H.), and the Divine Promise read thus:

"I give you a Sign of Mercy even as thou asked. I have heard thy supplication. And with My Mercy have I clothed thy prayers with acceptance. And I have blessed for thee thy journey. Sign of Power, Mercy and Nearness is given to thee. A Sign of grace and Bounty is granted to thee. O! Conquerer, peace be with you. God has spoken so that those who seek life may be saved from the Claws of death and those who are buried in graves may come out of them, and that the excellence of the religion of Islam and the dignity of the Word of God may come manifest unto the people and that truth may come with all its blessings and falsehood may run away with all its wickedness, and that the people may know I am the Mighty. I do what I wish and that they may be convinced that I am with thee and that those who believe not in God and reject His Religion and His Book and His Messenger Mohammad (S.A.W.S.) may find an open sign and that the way of the offenders may become manifest.

Glad tidings to thee. He shall be an intelligent boy. He shall be of thy own seed and of thy own progeny and race. He shall be thy guest. His name is Emmanuel and also Bashir. He is given the Holy spirit, He is free from sin. He is the light of God; blessed is he who comes from Heavens. With him is FAZAL who shall come with his coming.

Much greatness, grandeur and wealth shall belong to him. He shall come unto this world and he shall cure many of their diseases through his Messianic power and with the blessings of the spirit of truth. He is the word of God, because the Mercy Jealousy of God have sent him with the glorious Word. He shall be extremely intelligent and gifted with the wonderful understanding. Meek of heart shall he be. He shall be filled with all kinds of knowledge appertaining to things external and hidden. He shall make four of three. It is a Monday. Blęssed is the Monday. A loving son. Sweet is his name. He is a manifestation of the First and the Last; an image of Truth and Glory; as if God Himself had come down from Heaven. His advent shall be most blessed and it shall be manifestation of the divine Glory. The Divine Light is coming—the Light Divine! God has anointed him with scent of His pleasure. He shall grow up with amazing speed. Prisoners and slaves shall be released through him. His fame shall spread into the corners of the earth. Nations shall be blessed through him".

Hours passed into days; days into weeks; weeks into months and months into years and the great day of the fulfilment of the Divine Promise came when according to the revealed words a son was born to the Promised Messiah (peace and Blessings of Allah be upon him), on a Saturday, the twelveth day of the second calender month in the year of one thousand eight hundred and eighty nine, at a small town of Qadian amidst the plains of Eastern Punjab. The Son was given the name of Mahmud, '*the praised one*' and also Bashir, '*the giver of glad tidings*,' as instructed by the Divine Power. There was a great rejoicing at the birth of the praised one for it was a day of victory of the Word of God and the religion of God. The onlookers were struct amazed by the Divine *halo* that encircled the infant, and prayers were offered for a long, holy life of the giver of glad

tidings.

As the days rolled by; trees started bearing fruits and plants blossomed with colourful flowers, the Promised Son grew up possessing a pure heart; an exact image of the Divine Sign and worthy of being known as the illustrious Promised Son of the Shield of Islam; worthy of being called with the beautiful names of Mahmud and Bashir, worthy of the creation of the Creator of the Heavens and the earth and all that is between them.

Though he could not succeed in his academic life for he hardly passed his Matriculation Examination yet as he grew up to an independent understanding he became more and more well versed in the Holy Quran; the code of Religion and Humanity. He took little or better still no interest in the materialistic life and was heart and soul inclined toward his Creator. Day after day he yearned for spirtual advancement; communication with God and sought His Love only. Love of God was his motto and what a praiseworthy motto it was.

When the Promised Son was in his teens, he had to taste what every man has tasted since the age of Adam and Eve. 26th May 1908, the darkest day in the history of Islam came when, the Promised Messiah (P.B.A.U.H.) with the words of "Eli, Eli", on his lips peacefully gave up the ghost. The thought of father's death was not so piercing and painfull to the Son as was that of the passing away of the Shield of Islam, when its services were most needed. The Son had no power to put life to the dead body for the Promised Messiah's soul had been delivered by Israel to where it belonged. Whatever comes from the Heavans goes back to the heaven and the Son could not fight against the proceedings of nature. He had to respect the wishes of God. The Promised Son being

a firm believer of the Most Glorious and the Greatest Power took refuge in prayers and depended on the sacred Words: "Is not God All Sufficient for His Servants," which was revealed to the Promised Messiah on the death of his honoured father and the Promised Sons blessed grandfather, Hazrat Mirza Ghulam Murtaza of the famous tribe of Barlas.

The Promised Messiah was succeeded by a worthy, humble, and God fearing companion and deciple, Hazrat Maulana Noor-ud-Din as the First Caliph of the Ahmadiyya Movement in the fold of Islam. The Caliphate of Hazrat Maulana Sahib (May his soul rest in peace), was a short one for only a few years later he passed away to join the Promised Messiah and the Blessed ones of God in Heavens.

The sudden demise of the First Caliph was an unexpected and a tragic one. On Maulana Sahib's death the destiny of the Community stood treambling on a steep edge; there seemed no one who could lead the organ successfully through the heavy storm of troubles and hinderances. The opponents rejoiced his death; campaigns were susporsoned by independent parties as well as the government to bring the Community to dust, but the All-Powerful Power was there to protect the destiny of the Community. In the grief striken days the Holy God once again came to the rescue of His mankind, appointing the Promised Son as the Leader, guide, pilot and navigator of the Community; protector and an ambassador of the Divine Word in the world, and the Caliph of the present age.

The succession of the illustrious Promised Son was doubted by many of weak faith; many trembled thus falling spiritually; men of weak and superficial faith separated themselves from the main body forming another under the banner of Lahori

Ahamadis' with their headquarters at Lahore in the West of Punjab; some went as far as accusing the appointment as fraud; many foretold disaster for the Community but the majority of God-fearers accepted his appointment thus gaining spiritually in faith and rightfully deserving the Al-Mighty's choicest Blessings.

At the young age of twenty and five the Promised Son was entrusted upon the heavy responsibilities of Caliphate. It was the age when many do not carry their right senses, that he had to navigate the Community through the stormy oceans of troubles and spread the word of God in all cornors of the universe. At this young age he had to offer himself for disscussion, for the sake of God, to the multitudes of highly experienced and intellectuals of the world. But inspite of his young age, immense responsibilities and powerful opposing elements, his ability in handling the affairs of the Community have been astonishing that could scarsely be imagined. His clever navigation of the ship of Divine Word has lead to the spread of the Ahmadia Community throughout the world. The Promised Sons' divine and inspiring leadership has gained a strong cemented foundation, prestige, honour and respect for his mission on the whole of the globe.

Inspite of bitter oppsition, both at home and abroad, from Christians, Hindus, Sikhs, Jews and his Muslim fellow breathen, the rate of progress of the community under his protection cannot be checked, for the storm has become so great that anyone trying to stop it gets drowned and the wind is so fast that anyone who tries to block it is crushed to pieces. Inspite of all the troubles, hurdles, hinderence and opposing barriers the Community progress is at its height and all its credits go to the Promised Son.

"He shall come unto this world and cure many of their diseases through his Messianic power and with the blessings of Truth.....He shall be extremely intelligent and gifted

with a wonderful understanding ....."States a part of the prophecy of his landmarking birth. Doubtlessly he has cured many of their diseases. The Promised Son has restored sight to the spiritually blind ; ears to the spiritual deafs ; sustenance to the spiritual lepers and raised thousands of spiritual dead bodies from their graves. Multitudes in thousands come to pay their greatest respects and sit at his feet or under his shadow. Millions send their requests of prayers to him and scores of mutitudes have been blessed with his blessings of truth. His blessings have no bounds and reach as far, and still further, than San Francisco in the West, Tokyo in the East, Arctic in the North and Antarctic in the South.

Extremely intelligent and gifted with a wonderful understanding he is. His '*editions de luxe*' have been considered and still are the most unique. He has written books on different topics and some of his extraordinary publications are : Ahmadiyyiat or the true Islam ; the existence of God and Doctrine of fate.

The Promised Son's,' Introduction to the Holy Quran', has not only been considered to be the best but also the most complete one to date. His knowledge on religion is so vast and consumerate that in the present world no one dares stand on the opposite side of the platform he occupies to discuss any religion, may it be Christianity, Hinduism, Sikhism, Jainism, Judaism or the most complete and the latest code, Islam. The highest degrees of honour and merit have been conferred upon the Son.

".....He shall be filled with all kinds of Knowledge appertaining to the things external and hidden....." All kinds of knowledge, veiled and unveiled have been gifted to him. His prophecy regarding Chinas' aggressive danger to India was announced when not an atom of doubt could be seen and it could be least suspected ; when the placards, posters, banners, signboards

and appluds of, *Hindi Chini Bhai Bhai*, could be heard echoing in cities, towns, villages, streets, shops, public and government centres of India as well as China. None could suspect that the roars of 'Hindi Chini Bhai Bhai' amidst the high plains of the Himalayas would change to, 'Chini Kutta Hai ! Hai'! And least could it be suspected that praises and heroworship of the two nations for each other would turn to abuses, insults and bitter remarks, nor could it even be suspected that the Indian Radio or the Voice of India would utter even a monosyllable insult on China. But the Promised Son prophesised it in such prevailing circumstances and declared that not even ten years would pass for the fulfillment of the Divine Words. Besides this his other numerous announcement also have come true.

"Great is his name", and surely great it is. He is Bashir, 'the giver of glad tiding' ; he is Mahmud, 'the praised one' ; he is 'Fazl' and he is 'Fazl-i-Omar'. Neither his name nor his fame is unknown to the streets and alleys of Africa, Asia, Europe and America, nor are the remote Islands of the paciffic unaware of them.

Prisoners and slaves were to be freed through him. Prisoners and slaves have been freed through him. Prisoners of the cells of evil ; prisoners of pleasure seeking ; slave of unjust desires and passions ; slaves of Satan, slavess of the brutal governments of Imperialism, Colonialism, and Capitalism have been freed through the praised one. Others have been and still are repeatedly called upon with open hands, hearts and bossoms to join his fold to gain freedom.

".....Nations shall be blessed through him".

His Caliphate witnesses the independence of many a country of Asia and Africa. Most of the African countries,

nearly fourty out of fifty have been blessed with independence. Others are leading towards their goal and so is the case with the underdeveloped countries of Asia.

Under the Promised Son's and only the Promised Son's divine Caliphate do we witness the translations of Holy Quran in different Oriental, Continental, African and Latin American languages. Most of them have been run through the machines of the press and are being delivered to the seeker of truth and some await publication.

Missions. mosques and religious centres in the United States of America, United Kingdom, Kenya, Uganda, Tanzania, S. Africa, Mauritius, Ghana, Nigeria, Sierra Leone, Germany, Holland, Switzerland, Indonesia, Malasia and other countries appearing on the world globe prove the growth of Ahmadiyyat and Islam under the 'giver of glad tidings', leadership.

His missions publish pamphlets,. newspapers and religious literature from New York, London, Nairobi, the lands of Mauritus, Indonesia, Ghana, Nigeria, Germany, India, Holland and other key stations of the world.

Publication of literature under his guidance is at its height at the headquarters. Volumes proving the emptiness of beliefs of other religionists and schools of thoughts and crushing the central pillar doctrines of the great religions as interpretted by their respective present representative have been published in uncountable numbers.

The greatest of all, his personal's can be seen expounding the beauties of Islam; delivering the treasures of truth and politely requesting others to dig them out; burning the effigies of evil; giving *Glad Tidings* to the children of Adam and Eve; accepting the challenge of Satan

and defeating Satan with the help of Allah; revealing the truth; becoming successf l in the crusades against Satanic elements; lightening the nights of spiritual blinds; raising the spiritual deads from their evil graves; spreading the word, the greatest word of One God, the Universal God and the only God, *Allah*; cleansing spiritual leapers; distributing berries of spiritual life and bringing forth pure crystal clear springs of divine Light in different corners and nooks of the world, caves and tunnels of mountains, towns, villages and the countrysides of the abode of mankind.

During the Promised Son's Caliphate the once proud Christians have faced and are facing their greatest belligevent. So much so that today they do not refrain from confessing their defeat openly. Multitudes in thousands have realised the emptiness of Christian doctrines and many are embracing Islam under his fold.

A good example of the Christian's defeat by a humble missionary of the Promised Son is crystal clear to the people. Billy Graham a very reputed and respected American missionary and the defender of Christian faith was issuing vast challenges to Islam. But no Muslim had the guts to face Billy, which made him more courageous to throw abuses and the worst nonsense on the Universal God, the Holy Prophet (P.B.A.U.H.) and the Holy Quran. At this critical stage when Islam was in danger, a courageous and faithful defender of Islam Al-Haj Maulana Sheikh Mubarik Ahmad Esq, the then Chief Missionary and Amir of the Ahmadiyya Movement in Islam in East Africa came forward accepting Billy's challenge and issuing another which Billy could have never faced.

Billy Graham on hearing the challenge repented of having ever issued a challenge to Islam; cursed his destiny; wished he had born dumb for he had done the greatest mistake

as had never been done by his forefathers, for the challenge, issused by Sheikh Sahib was far more tough then Billy could accept. There was no alterative for the boastful Christian missionary than to hide his face from the world. Billy on hearing the challenge rushed back to America, most probably forgetting his clothes back in Nairobi. Since then not a single utterence has been heard from Billy nor has he ever dared challenge Islam, for he knows that Islam's Lions can be found every where, in the snows of Canada, Praries of the States, Sahara and Kalahari of Africa, Alps and the snowcapped countries of Europe; under the shadows of Himalayas and amidst the equatorial regions of Asia. His lions have extended over the tropic of Cancer; under the tropics of Capricorn; all around the equator; on the east of Greenwhich Meridian and on the West of zero degrees longitude; on the coral Islands of paciffic and to other remotest parts of the globe.

The Promised Son's gift of communication with Allah is unmatchable. People from all over the world, no matter what caste, creed or colour; no matter what religion, belief or faith send their request of prayers to his Holiness. His prayers have given birth to great world famed believers like His Excellency Sir Chaudhry Muhammad Zafarullah Khan, the Honourable Late Sheikh Amri Abedi, Dr. Abdus-Salam and scores of others. His prayers have exceeded all bounds.

His divine leadership has brought the Movement from a few deciples to a multitude. Thousand have accepted the Word of God; thousands are embrasing it after gaining light and the Holy Spirit, and billions are being invited with open hands and hearts.

Thus do we conclude that the Caliphate of the second Caliph has been the most successful. He has in reality proved himself to be the worthy Promised Son of the Promised Messiah,

the Bashir, 'the giver of glad tiddings', the Mahmud 'the praised one'; the present defender of Islam, the successful captain, pilot, and navigator of the Ship of Islam, the guide of the greatest religion ; the protector of the Holy Quran and the image of the Divine Promise.

The Son's caliphate has witnessed vast changes. People that keep faith in only one God have enourmously increased, and spiritual truth among people of the wide world has considerably wideness. The gaps casued by the deaths of the Promised Messiah (peace and blessing of Allah be upon him) and the First Caliph Hazrat Maulana Noor-ud-Din Sahib (may his soul rest in peace) have been properly filled, and the heavy blow well resisted. Never has such universal honour been confired upon anyone in the present age as has been conferred upon him. The Promised Son rules and reigns the hearts of millions with his divine Power of love, gifted by the All-Mighty. Besides his great age the Sons wisdom, gift of truth and vast experience still has the greatest influence where no one could ever dream. Much has he been loved during the past years, much more is he being loved at present and much more will he be loved in future.

All praise belongs to Allah that He gifted Ahmadiyyat with such a worthy and humble leader as Hazrat Mirza Bashir-ud-Din Mahmud Ahmad Qadiani. He with his just and gifted powers, charm and amiability has won the affections of humanity.

His recent sickness has excited such great sorrow and grief that words cannot express. The news of his sickness has not only troubled Ahmadis and lead them to prayers for his long life but has also been greatly felt by other Muslims His ill health has fillend people with anxiety. Prayers are being offered in the mosques of the world for his long life. Let us also

pray that the Al-Mighty Allah grant the Promised Son a long, energetic, prospersous and happy life. "May He shower His choicest blessings upon the Promised Son and restore good health to him. May the son's shadow always remain over us. May he multiply the number of believers and may the world seek refuge under the Promised Son. May he live long enough to fulfil all the prophesis of his respected father and the Will of God. Ameen."

God save our gracious Caliph, Long live our Noble Caliph,
God bless our honoured Caliph : Make him Victorious,
Happy and glorioųs, Long to reign over us,
God grant long life to our Caliph.

Pray we always for him and will keep on praying for him; our beloved, endeared Promised Mwalimu Mahmud.

My Lord; If I worship Thee from fear of hell then burn me in hell; If I worship Thee from hope of paradise, exclude me thence; but if I worship Thee for Thine own sake, then withhold not from Thine eternal beauty.

(*Rabia Basri*)

Abdus Shakoor Aslam
M.Sc.

The Role of Muslims in Botany

Islam shows superiority over other religions in many respects. One of them is that it exhorts its adherents to strive for more and more knowledge and to meditate on the Universe. This is clear from the following verse :—

ان فی خلق السموات و الارض و اختلاف اللیل و النهار
لایات لاولی الا الباب الذین یذکرون الله قیما وقعوداً
و علی جنوبهم و یتفکرون فی خلق السموات والارض
(آل عمران)

"In the creation of the heavens and the earth and in the alternation of the night and the day there are indeed Signs for men of understanding. Those who remember Allah while standing, sitting and lying on their sides, and ponder over the creation of the heavens and the earth".

Accordingly early Muslims devoted their lives to search of knowledge whole-heartedly and as a result, they dominated over other nations in all branches of Science. During Umayyad and Abbasid period the zeal for knowledge was at its climax. The Muslims not only assimilated the splendid works done by the Greeks, by translating into Arabic but also carried out original experiments and researches and made far reaching advances in various fields of Science.

The Principal receiving the cheque from Mian Waheed Akhtar, Regional Manager National Bank of Pakistan as a donation towards the development project of the College.

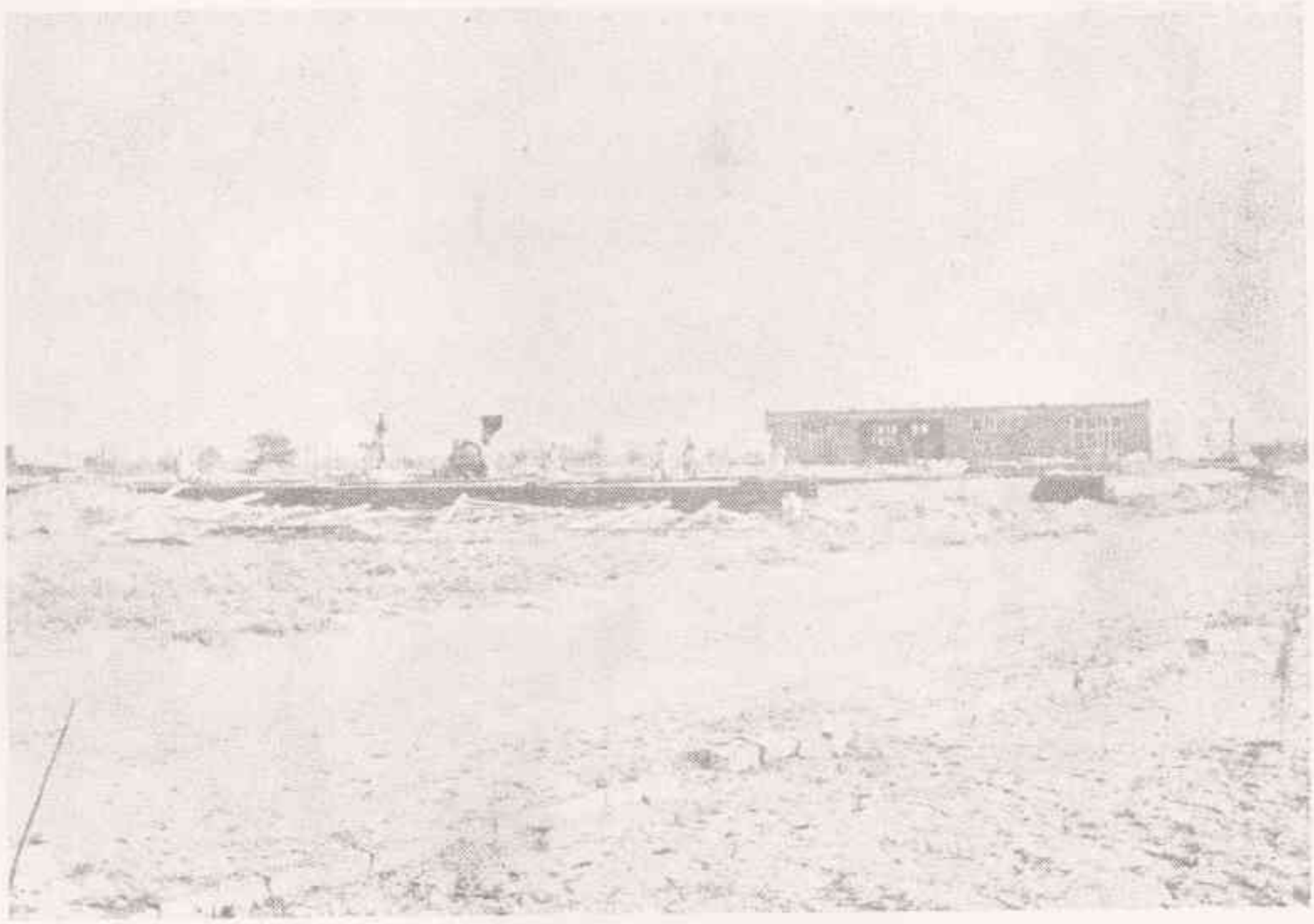

Science Block at the New Camps under construction.

A well known scientist H.G. Wells, in his book "The Outlines of History" describes that the progress made by Muslims in science and other branches of knowledge was only due to Islam otherwise, the Arabs before the advent of Islam were merely pagan people. He says, "For some generations before Muhammad, the Arab mind had been, as it were, smouldering, it has been producing poetry and much religious discussions ; under the stimulus of the national and racial successes, it presenly (i.e., after the advent of of Islam) blazed out with a brilliance second only to that of Greeks during their best period. It revived the human persuit of science. If the Greek was the father, then the Arab was the foster-father of the scientific method. Through the Arabs it was, and not by the Latin route, that the modern world received that gift of light and power".

Similarly describing the revolution caused by Islam he says "Islam prevailed because it was the best social and political order the times could offer. It prevailed because everywhere it found politically apathetic peoples robbed, oppressed, bullied, under-educated, and unorganized and it found selfish and unsound Governments out of touch with any people at all. It was the broadest, freshest political idea that yet come into actual activity in the world, and it offered better terms than any other to the mass of mankind. The capitalistic and slave-holding system of the Roman Empire and the literature and culture and social traditions of Europe had altogether decayed and broken down before Islam arose".

Thus under such adverse circumstances Muslims obeying the Word of Allah started a campaign in search of knowledge. They studied the old books of each and every country in response to the Holy Prophet's saying :

and adding their own original works translated those books into Arabic. Had the Muslims only translated the Greek works even then it would have been a magnificient contribution. A great historian Phillip K. Hitti says "Their translations transmuted in no small degree by the Arab mind during the course of several centuries, were transmitted, together with many new contributions, to Europe through Syria, Spain and Sicily and laid the basis of that canon of knowledge which dominated medieval European thought and transmission from the standpoint of the history of culture, is no less essential than origination, for had the researches of Aristotle, Galen and Ptolemy been lost to posterity the world would have been as poor as if they had never been produced."

Similarly famous historian Henry Smith Williams, LL.D. who is one of the first class prejudiced enemies of Islam, although attributes hundreds of wrong things to Islam, when describes the Muslim work in pursuit of knowledge, cannot resist telling the truth. In his book the "Historian's History of the world" Volume VII, he describes, "It may be boldly asserted that the numerous translations and still more numerous commentaries which the Arabs wrote on all the works of Ancient Greece and which make their literature the second daughter of Greek literature, served to give the modern peoples their first notions of the sciences and letters of antiquity".

It is worth mentioning that just when the Muslims were engaged in such scientific researches the whole of Europe was steeped in superstitions and ignorance. Christian religious leaders were excommunicating those people who

dared to take up a study of science. The same Historian Henry Smith Williams says, "If we trace the whole history of human knwoledge, and recall the fact that Greece survived Rome in Alexanderia, we may well assign the Arabs the position of guardians to that sacred depot between Greece and the Renaissance. "They merit," says M. Libri, "eternal gratitude for having been the preservers of the learning of the Greeks and Hindus, when people were no longer producing anything and Europe was still too ignorant to undertake the charge of the precious deposit. *Efface the Arabs from History and the Renaissance of letters will be retarded in Europe by several centuries*".

Similarly he says, "It ,was thus that the influence exercised by the Arabs manifested itself in every branch of modern civilization. From the ninth to fifteenth century the most voluminous literature extant was formed, productions were multiplied, valuable inventions attested the wonderful activity of men's mind at this epoch ; and their influence, felt throughout Christian Europe, justified the opinion that Arabs have led us in all things.....Does not all this reveal the work of a people too long disdained".

Thus the Muslims made contributions almost in every branch of knowledge as Architecture, Poetry, Fine arts, Philosophy, Astronomy, Astrology, Mathematics, Mineralogy, History, Geography, Historography, Medicine and Biological sciences.

Hereunder I give a very brief summary about the contributions of Muslims towards Botanical science only.

Even at the time of Holy Prophet Muslims knew about the Male and Female reproductive parts of the flowers

and this is why they used to cross-pollinate the palm trees. The Holy Quran revealed about the sex of the plants in the following verse :

و من کل شیئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (زاریات)

"And of every thing have we created pairs, that you may reflect". (50-51)

During Abbasids the Muslims made tremendous researches in the field of Natural History especially Botany, pure and applied. They made correct observations on sexual differences of plants such as palms, hemps etc. Ibn-Hundhail (ابن هذیل) wrote a book named Hilyatal-Fursan wa Shiar-al-Shajran هلیة الفرسان و شعار الشجران where he described such researches about the plants. Ibn.Sabin (ابن سبعن) attempted the classification of the plants in an answer to Emperor Frederick's question, He classified the plants into 3 categories (i) plants which grow vegetatively (ii) plants which grow by seeds and (iii) plants which grow by other than these two methods.

A physician of Cordova (قرطبه) Al-Ghafiqi Abu Jafar Ahmad Ibn-Muhammad (الغافقی ابوجعفر احمد ابن محمد) [1165] collected a number of plants from Spain and Africa and suggested their possible nomenclature in Arabic, Latin & Berber. He not only classified but also gave a comprehensive description of those plants. He also wrote a book Al-Adwiyah tal-Mufradah (الادویة المفردة) a part of which dealt with the various medicinal plants, plant diseases and their control.

Towards the end of 12th century Abu-Zakariyya Yahya Ibn Muhammad Ibn-al-Awwam (ابوذکریا یحیی ابن محمد ابن العوام) wrote a book "al-Filahah (الفلاحة) which was considered most important and outstanding medieval work on agriculture. He gave a complete description of 585 plants and new methods of cultivating 85 fruit trees. He also described the new

and this is why they used to cross-pollinate the palm trees. The Holy Quran revealed about the sex of the plants in the following verse :

و من کل شیئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (زاریات)

"And of every thing have we created pairs, that you may reflect". (50-51)

During Abbasids the Muslims made tremendous researches in the field of Natural History especially Botany, pure and applied. They made correct observations on sexual differences of plants such as palms, hemps etc. Ibn-Hundhail (ابن هذیل) wrote a book named Hilyatal-Fursan wa Shiar-al-Shajran هلیة الفرسان و شعار الشجران where he described such researches about the plants. Ibn.Sabin (ابن سبعن) attempted the classification of the plants in an answer to Emperor Frederick's question, He classified the plants into 3 categories (i) plants which grow vegetatively (ii) plants which grow by seeds and (iii) plants which grow by other than these two methods.

A physician of Cordova (قرطبه) Al-Ghafiqi Abu Jafar Ahmad Ibn-Muhammad (الغافقی ابوجعفر احمد ابن محمد) [1165] collected a number of plants from Spain and Africa and suggested their possible nomenclature in Arabic, Latin & Berber. He not only classified but also gave a comprehensive description of those plants. He also wrote a book Al-Adwiyah tal-Mufradah (الادویة المفردة) a part of which dealt with the various medicinal plants, plant diseases and their control.

Towards the end of 12th century Abu-Zakariyya Yahya Ibn Muhammad Ibn-al-Awwam (ابوذکریا یحیی ابن محمد ابن العوام) wrote a book "al-Filahah (الفلاحة) which was considered most important and outstanding medieval work on agriculture. He gave a complete description of 585 plants and new methods of cultivating 85 fruit trees. He also described the new

methods of grafting and other vegetative means of reproduction. Moreover he dealt with the properties of soil and manure; symptoms of several diseases of trees and vines and their methods of cure.

In Samarqand, Bukhara and other cities, extensive studies were made on various varieties of date, apple, apricot, peach, plum, lemon, radish, cucumber and rose etc.

Sugar which has now become an indispensible ingredient in the daily food of civilized man was first produced and refined in Baghdad and Spain and was later introduced into Europe. Ibn-e-Wahshiya (ابن وحشية) was also a great Botanist and wrote treatise entitled "al-Filahat-al-Nabatiyah" (الفلاحة النباتيه). He wrote the description of numerous plants of Agricultural and Economic importance and especially dealt with the methods for the extraction of scent from rose and other flowers. This invention of scent extraction has wrongly been attributed to Noor Jehan.

Abdullah Ibni-Ahmad Ibnul-Baytar (عبدالله ابن احمد ابن بيطار) was considered to be the best known Botanist and Pharmacist of the Muslim world in those days. He travelled through Spain and North Africa and studied thousands of herbaceous plants. After entering the service of Ayyubid al Malik al Kamil (الملک الکامل ایوبی) at Cairo, he made numerous trips throughout Syria and Asia Minor and made extensive researches on herbaceous plants. He wrote numerous books of which two are very important, "al-Mughni-fi-al-Adwiya al-Mufradah" (المغنی فی الادویة المفردة) and "al-Jami-fi-al-Adwiyah al-Mufradah" (الجامعه فی الادویة المفردة). The former book was considered to be the best materia medica where thousands of plants were described with their medicinal value; the latter deals with the disease remedies of plants based upon Greek and earlier

Muslim's data supplemented by the author's own experiments and researches. He described symptoms of diseases and remedies of about 200 plants not described by earlier workers. He quoted about 150 authors of whom 20 were Greek.

Ibn-al-Khatib (ابن الخطيب) a Spanish Arab living at Granada (غرناطه) well understood the phenomenon of infection. In the middle of 14th century a disease called Black Death appeared in Europe in an epidemic form. The Christians called it an act of God and nobody attempted to get a cure of it, but Ibn-al-Khatib diagnosed this disease as due to infection. He defended the theory of infection in the following words, "To those who say, "How can we admit the possibility of infection while the religious law (Christianity) denies it"? We reply that the existence of contagion is established by experience, investigation, the evidence of the senses and trustworthy reports. These facts constitute a sound argument. The fact of infection becomes clear to the investigator who notices how he who establishes contact with the afflicted gets the disease, whereas he who is not in contact remains safe, and how transmission is effected through garments, vessels and earings."

The subject is so vast that many pages are required to write various contributions of Muslims in this branch of science but I have given only glimpses of these works to creat curiosity in the minds of readers so that they could study Muslim History and know how beneficial the Muslim Scientists were to the society. We can rightly say that they were the fore-runners and founders of modern researches in Botany and other branches of science.

History reveals that during 9th and 10th centuries, students from Spain and other European countries journeyed

to Egypt, Syria, Iraq, Persia and other Muslim countries in quest of learning. They studied at the feet of Muslims and went back to their countries. In 11th century Muslim Scholars themselves started pouring to Spain and other European countries, where they not only inspired the European people with the scientific researhes but translated many of their works into Latin. During 11th to 13th centuries thousand of books were translated from Arabic to Latin. An African Constantine was probably the first man who translated the the book "al-Kitabul Malaki (الكتاب الملكى)" into Latin. Gerard of Cremone also translated some books on Medicine and Botany from Arabic to Latin. In this way European people were inclined towards scientific researches and this is why so many English terms even used today owe Arabic origion e,g. Julep (Julab), Syrup (Sharab) Soda, (Sueda), Dura Mater, From al Ummul Jafiyah (ام الجافية) Pia Mater, (from al Ummal Reqiqa ام الرقيقه) etc. Similarly Alcohol, Alkali, Antimony and so many other elements also possess an Arabic origin.

I hope that the Muslim work in other branches of science and literature would be picked up by some curious students of the college and this will be a way to pursuade our students to follow the footprints of early Muslims.

(Observer)

A Glimpse of College Life

Characters :

Ishrat.....*A dandy first year chap.*

Amjad.....
Anwar..... } *His class fellows*
Akhtar..... } *A little sober-minded student*

A Lecturer

Scene. I

(Its first day of the college after the new admissions. There is quite hustle and bustle; students are loitering in the verandahs, many happy and gay faces are to be seen. The new first year chaps gossiping, are passing queer remarks)

Ishrat : Good morning, Amjad. How are you?

Amjad : O.K. Why so late, Ishrat? I waited for you at my house for five minutes but you didn't come.

Anwar : (*interrupting*) He must be pre-occupied with make-up.

Ishrat : (*shyly*) Why not? It's the day of rejoicing. The rod of the school master is off us after ten long years.

Amjad : Really. You've reached the core of may heart.

Akhtar : Truly, we are free from day-to-day threatenings of the teachers.

(There goes the bell. First year students begin to move towards their class-room. They make so much noise that nothing can be heard.)

Chairs (*L to R*) Mirza Fareed Ahmad (*Asstt. Secretary*) ; Abdul Rashid (*Joint Secretary*) ; Ata-ul-Mujeeb Rashed (*Student President*); Sahibzada Mirza Nasir Ahmad M.A. (Oxon) *Principal* ; Dr. S.M. Shahid M Sc. Alig., Ph.D. London., A.R.I.C. (*President Incharge*) ; Nasim Ahmad Saifi, (*Secretary*) ; Jamil Latif (*Best Speaker*).

Standing (*L to R*) Sh. Suleman ; Ismatullah Javaid ; Mohammad Azam ; Ahmad Karim.

Anwar : The bell has gone. Let's go.

Akhtar : Come along. See what a great noise, quite a jolly life.

Ishrat : Was'nt I right Amjad? Had we been in school, how could one dare do so?

Amjad : No, no. Never.

Anwar : Hush! here comes the lecturer.

Ishrat : What's then. Let him come.

(The lecturer comes into the class-room and after taking the roll-call addresses the students)

Lecturer : As you know, boys it's your first day in the college, so it is necessary to remove certain misconceptions you might have formed.

(Students try to interrupt him but are made silent by his commanding voice)

Think not that you have broken the chains once for all. You are still to maintain discipline and obey the college authorities. Let it be clear to you that you have entered a new phase of your life and greater responsibilities have fallen on your shoulders. Learn to work yourselves now and leave your childish habits. Well has it been siad, "Well-begun is half done", so mend your ways just now and start working zealously. Take the time by its forelock, putting all your efforts and energies to achieve your goals—so that you may not regret afterwards.

(The bell goes; the period is over; the lecturer leaves the class; students re-burst into a sea of noise. After vacating the room they are crowding in the corridor, passing queer comments).

Ishrat : Did you listen to the tall talk of the lecturer Amjad.

Amjad : Yes. He only wanted to overwhelm us with the flow of his words and nothing else. Isn't it.

Anwar : Really. He posed himself to be a sage.

Amjad : Such things we used to hear from our teachers in schools off and on. I'm too tired to have them any more.

Akhtar : Don't say such things. I was quite impressed by the noble talk of the lecturer.
Rare pieces of advices, indeed !

Ishrat : What a fool you are !

Amjad : Quite strange. Akhtar is chip of the old block.

Anwar : His wits have become shallow.

Ishrat : Leave him with his outworn ideas. What's the use of a college life if we bind ourselves by all those restrictions again.

Amjad : Nothing. We must enjoy the wonderful life.

Anwar : Let's make programme for games.

Ishrat : We had better go to the tuck-shop. We've ample time to discuss such things.

Amjad : *(agreeing)* That's a suitable place. A fine rendezvous ! Let's go.

(*All of them go to the tuck-shop. Many other students are also sitting, indulged in different talks.*

Ishrat : (*going to the counter-table*) Send us a set of tea. Mr. Yousaf. Take care that it's strong.

Amjad : Only tea !

Ishrat : Oh, I forgot ! Send some cake pieces too.

Amjad : (*seeing Ishrat smoking*) *give me a puff of the Cigarette too.*

Ishrat : Do have it. See, what a fantastic relish it gives!
(The servant brings the tea)

Anwar : Let's have tea first.

Ishrat : *(taking a cup of tea)* We had started talk about games. What's your opinion, Amjad.

Amjad : I wish all of us played basketball.

Anwar : That's a good idea, indeed.

Ishrat : I approve it, too. Besides us, Aslam, Waheed, and Kausar will join us. It would be very interesting to play this game.

Anwar : Who will be the Captain. I think Amjad is the best.

Amjad : No, no Ishrat is the best player. We accept him as Captain. Agreed !

Ishrat : Be it so.

Anwar : Fix the time also.

Ishrat : 3 o' clock will suit.

Amjad and others : Quite right.

Akhtar : Let's go now. Only five minutes are left in the next period. We are getting late.

Ishrat : Go yourself. We haven't any connection with you from to-day. You silly !

(Akhtar goes to the class-room alone. The rest remain sitting in the tuck-shop)

Amjad : We've a lot of time yet. Why bother about studies just now.

Anwar : Yes, no need of attending the classes regularly. We'll prepare from notes when the examination draws near.

Ishrat : It's quite an easy job. The future is not yet born, it's the present we are concerned with. Cheer

up, friends. Enjoy the college life.

Scene II

(Time rolls on. The academic year is nearing its end. Fear of examination is haunting the idlers like the sword of Democles: They are crest-fallen. But there are a few radiant faces glowing with inner exultation.)

Ishrat : How many days are left in the Annual Examination. Amjad ?

Amjad : It's at hand. Only a week.

Anwar : Ah me ! A week.

Ishrat : What shall I do ? I forget everything.

Amjad : My condition is too precarious.

Anwar : And mine is worse !

Akhtar : Hadn't I asked you not to absorb yourself too much in games and other frivolous pursuits. It's not the house of examination that you shall get through due to your role in games. It's mental ability which counts here. Take lesson even now.

Ishrat : Shut up ! You fool !

Amjad : Leave that book-worm, Ishrat.

Scene. II

(The results are out. Students are looking for the newspapers anxiously.)

Ishrat : They say, The result is out, Amjad.

Amjad : Is it. Let's see the news-paper.

Anwar : (*coming sorrofully*) I've searched out thoroughly There aren't our roll numbers in the news-paper.

Ishrat : (*half broken-heartedly*) Really.....

Anwar : Believe me. We've all failed.

Ishrat : (*cursiug himself*) Alas ! Woe to me.

Amjad : Whose photo is this ? Let me see.

Anwar : Oh ! that's Akhtar's !

Ishrat : (*startled*) Akhtar.!

Amjad : (*with great surprise*) Has he stood first ?

Anwar : Of-course.

Ishrat : Wonderful, indeed ! Wonderful. How I wish I had attended the classes !

Amjad : (*repenting*). Would that I had acted upon the advice of our lecturer from the very first day !

Anwar : Had we been as attentive to studies as in games and other pursuits, this calamity would have been averted !

Ishrat : True. True. It's we who were mistaken. Not he. Not he.

LET US DEFINE

True Love.....**A water fall in the Sahara Desert**

Marriage.....**"Mirage" mis-spelt.**

Cosmetics .....**The dazzling paint given to an iron bar when scratched off it reveals but only rust.**

Sex..... ...**A mystery for the infant, discovery for the young ; a loss for the old.**

War.....,...**A hobby practised by the ambitions with lead.**

Husband .....(*In the eyes of the wife*)
A money making machine.

Wife (*In the eyes of husband*) **Always true, loving, loyal, and faithful to her shopping.**

Life .....**A bed of roses each one of which has thorn hinding behind it.**

Slap.....**The begining from a very long journey.**

Love at first sight.....**Diving into a swimming pool with a new suit on.**

Muhammad Zakria II Year.

Making the Best of Things

There is embodied a lofty truth in the following oft quoted verss :

"*Do all you can*

"*For you are a part of God's great plan*".

"Making the best of things" signifies that every human being should develop the faculties with which he has been endowed. If he possesses a poor and shattered health, he should improve it by taking regular physical exercise. If he has only a mediocre intelligence, he should put in his sincerest efforts to develop his mental faculities by dint of diligence and perseverance. If he goes on making the best use of what he has at his disposal, he will unquestionably succeed in outstripping others in the race of life. He may ensure success for himself even better than those people who are blessed with a high degree of intelligence but who do not make the best of things. Those who wish to earn a good name or attain a high reputation must make the best use of what they possess. If they aquire moral perfection, let them cultivate the human part of their nature. And if they are keen on attaining the the highest peak of manhood they should utilize all their powers and faculties which God has conferred on them.

God in His ever merciful disposition, has kindly and generously blessed man with innumerable faculities as

well as powers, and it can by no means be His design that these should be allowed to rust unused. One may not be a very talented person or one may not be qualified enough to occupy the highest position in life, but it is incumbent on one to make as best a use of one's power as one possibly can. And on doing so, one is not only appreciated and rewarded by the popular voice of veneration and esteem, but one enjoys also the inward satisfaction of one's own conscience which is clean and clear of fears of all sorts.

It is a universal fact that all men are not generally endowed with the inventive mind or blessed with favourable circumstances. But they can easily make their lives successful and happy if they only care to make the best use of all the faculties that lie at their disposal.

It is within the reach of all.....! So, if they really want to make their lives easy and comfortable, and worth living they should in all possible ways employ and develop their own resources instead of sitting idle in despair. For ".....despondency is a Sin and inaction a Crime." If a man fails to realise the object of his life inspite of the best of endeavours on his part, his mission of life is not said to have been fulfilled. It has been justly said that a man is to put the best of efforts in the faithful discharge of his duties while the fruit of his labour lies with his Creator.

"If I be given", said a Philosopher, "one of the two things.....happiness and the pursuit of happiness..... I shall choose the latter".

Young men should therefore bear in mind that upon making the best use of their faculties depends a good deal

of their prosperity, comfort and happiness in life, as well as their social, intellectual, moral and spiritual progress. They have a particular mission on earth for the success of which they must try their best. But if people do not make the best use of the powers with which God has blessed them, they not only decieve themselves but also commit a great sin, to all intents and purposes, in the eyes of the Almighty.

So this virtue should be cultivated by all means. Those who do not believe in the Divine Dispensation foolishly sigh over their own lots, remain indolent and thereby make their lives wretched and miserable. Man is the architect of his fate and he can make his future glorious by his own endeavour.

Karim Qamar,
IV Year

Beautiful Flower.

With a fresh and sweet and charming colour,
Every morn is like a beautiful flower,
And thou be as a butterfly,
Love it fair and square as lover.

Pluck this flower leaps and bounds,
Pluck it for thy garland,
Lest it droop and drop into dust,
Honour it with a touch of pain from thy hand.

Pluck it, pluck it heart and soul,
So that thou may reach thy goal.

Board and University Rowing Champions

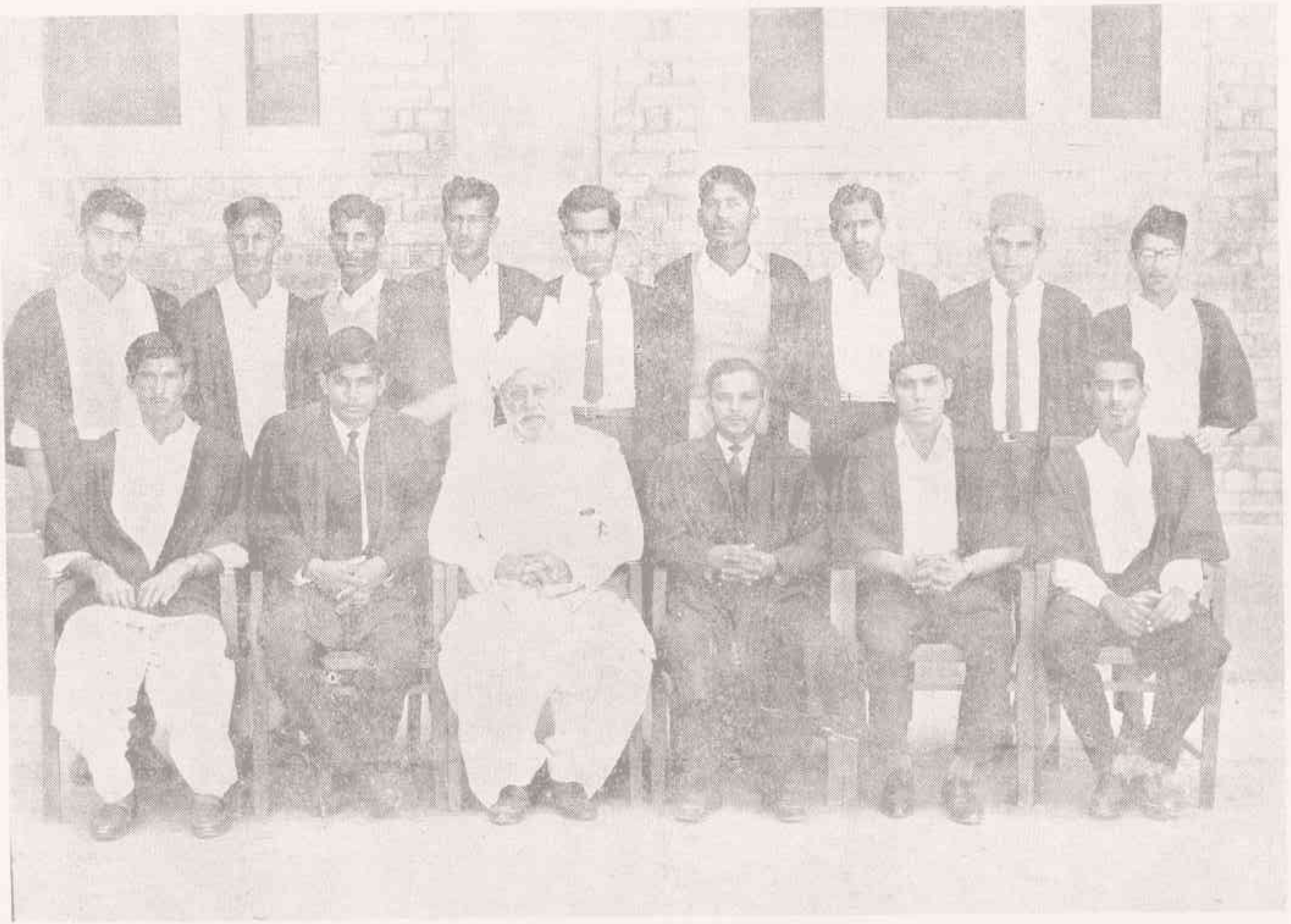

Chairs (*L to R*) Mohammad Siddique (*Sec. Degree Team*) ; Shahid Ahmed (*Captain Degree Team*) ;
Sahibzada Mirza Nasir Ahmad M.A. (Oxon) *Principal* ;
Ch. Hamid Ahmad M.A. (*President Rowing Club*); Mohammad Yousuf (*Captain Board Team*) ;
Sanaullah (*Secretary Board Team*).

Standing (*L to R*) Basit ; Rafique ; Maqbool ; Karamat ; Muzaffar ; Mukhtar ; Latif ; Jamil ; Izaz.

Tahir Qazi B.A. Part. I

The Day We Were Befooled

It was in the middle of April that one day I happened to visit a friend of mine, "Rifee". His room was packed with many other friends who were deeply absorbed in discussion. When I came to know that the subject under discussion coincided with my heart's desire, I was greatly delighted. It was so interesting a discussion that it roused my innermost feelings at once.

They were making a programme for hunting, the very idea of which was so thrilling and inspiring to me that I at once agreed to my friends' proposal and we decided to go for hunting early next morning.

The next morning we started on our way to a village near the river Chenab, where we intended to leave our small luggage that we had brought with us for the purpose of spending a night there. Nothing remarkable happened on our way and we reached the village in a very pleasant mood.

The Land lord of that village was a friend of Shamoo, one of our friends. And he was delighted to see us. He received us warmly and affectionately.

After taking some rest in the village, we went to the jungle at noon. We were five in number and every one of us had some kind of an arm. I had ·22 rifle while Rifee had double barrel gun and Shamoo and Saifee had knives.

It was still very hot when we set out towards the jungle. There were tall trees on both sides of the path. Here and there could be seen a thick undergrowth. On the far-side of the open stood a hill with two rocky peaks, shining brightly in the sun.

We had gone for hunting since noon but at about 6 p. m. in the evening we were returning from the jungle without any hunt. The sun was going to set and the wind moved like a tired traveller. The track on which we were walking was sloping down in a zig zag way. We were walking quickly because we still had a mile and a half to go.

All of a sudden there was heard a noise in the under-growth; a wild duck flew up, and then another, and within a short time Rifee has shot several ducks. I and Shamoo has also shot few. One duck fell down about a furlong away from us. Saifee went running towards it and soon disappeared in the zig zag undergrowth.

After waiting, for about half an hour, we were worried about him and started running in the direction where Saifee had gone, shouting while rnning but receiving no reply. We reached the lonely bushes where we had seen the bird disappear. There was a small pond not far from the bushes and a couple of tall bunyan trees stood still gazing at us by the side of the pond. We waited there for sometime and then shouted again but silence ruled every where; we could see nothing nor hear anything except the loud beatings of our hearts. We discussed among ourselves but a new fear brought us to a standstill.

The sun had already set and it was growing darker The shadows of various objects were lengthening around us,

the wind had ceased blowing. We stood near the pond in a manner as if we were enchanted or had seen an apparition.

At last we came to our normal senses, and decided to return to the village in order to call help. We ran so fast as if we were being followed by a ghost. Suddenly something grey scurried past us with a squeaking noise and we jumped away in fear. It was a rabbit. We were relieved a little but our hearts were beating loudly. We made as much haste as we could and rushed towards the village.

We went on running, jumping, breaking through bushes and branches until all of us were exhausted. Now we began walking, but in a very careful manner, as the mystery of the forest at night had frightened us. All of a sudden there arose a strange cry. We stood still and amazed; we peeped in the dark but there was nothing to be seen. Suddenly an idea came into my mind that the cry might be that of a deer, and it might attract a tiger. So I conveyed my idea to my frightened companions and they were extremely terrified.

As we had been running at a very fast speed we were now very close to the village, for we could see dim light of the Land lord's house and in exulation we gave a shout and ran with all our Stamina. As soon as we reached the the house of the Land lord, the door opened and believe me, the Land lord stood smiling in the door with Saifee behind him. He too was smiling. Good heavens! what a strange thing! Saifee who disappeared in the forest, was laughing heartily at all of us while all of us looked at him in deep amazement and profound wonder.

When, however, we came to know of the story as told

by Saifee, we too were amused. He said that he had followed the bird in the lonely bushes, and found it then made his way home the village through a short cut which he knew. He reached there early in the evening and was looking forward for a great fun. He further pointed out that he only wanted to put us in a bit of trouble to amuse himself.

After listening to the story we roasted the ducks and while we were eating our meals every one of us was admiring Saifee for his clever trick to befool us. What a jolly game he played! A charming amusement indeed!

Khalilur Rehman Shah

STRANGE EXPERIENCE

I descended down the train as it jerked to stop, gave my ticket to the collector at the exit and came out. I looked about me; there was no tea-stall or a fruitshop near the Station premises: I looked around a little further. but still no sign. I started treading the lonely road towards the city. No sound of any kind could be heard, not even the noise of children! Trees were there but without any life. The train whistled and departed for the next station, the silence got disturbed.

Just as I entered the first row of houses a man passed by me, I thought he was about to sneeze, but only some verses of Hamlet came out. Not understanding any thing I carried on. My wandering eyes fell on a child, munching something. When I approached him, the munched thing came out to be some pages of a story book. I forbade him from eating it and passed on. A humming of voices came from behind a building. I started towards and as the distance decreased, I saw a book-market. Surprised though I was, I proceeded on.

Unwillngly I read the sign-board of the nearest shop 'Regent Dinner Depot'. One was much bewildered for the customers coming out had books of various dimensions. I hesistatingly asked one of them as to why they had bought so many books and how come from a food depot. He got much surprised and spoke verses of Odeyssy. He then replied that they were for his dinner. I stood aghast, then laughed at his face with my parched lip and prophesied that it must

be a strange phenomenon in our world. He glanced at me threateningly and fourished his hand forced me to stop laughing and beg his pardon. I again enquired as to what he was going to have for his dinner. "History of England", he said, "we call it mutton chop, "Eight Poet's, and A farewell to Arms a dessert ". With what had he dined yesterday, I again asked, him controlling my scareness, "Jane Eyre", came the answer.

No sooner had I swallowed this information, when I heard, "Delicious Oliver Twist will do for tomorrow's breakfast." These gave me the solution to the puzzles of the sneezing man, and the munching child.

I strolled along to see the remaining mysteries. My tongue was completely dry by this time, and my lips were perched. I felt much thirst but no source of quenching it. I passed by a sign reading "Take Canterbury Tales' for headache". My curiosity which had been fully aroused compelled me to ask some one about the cooking method. So I touched the arm of a passing lady and made my inquiry. She condescendingly said "Take any book cooker, Majestic Book cooker will be the best, place it on the heater, pour some oil of 'Tom Jones', add some finely cut pages of English Grammer, and a good many pages of 'Sesome and Lillies'. Suppose you want to cook 'David Copper-Field', put it as a whole and cook for half an hour".

I was once again left alone with my wandering eyes, which sudenly rested upon an old man hastening away with 'Tess' under his arm. On my way I saw a closed 'Lunch Counter'. Neverthless I read the painted memo, Roasted Emmia, minced Women in White, Macbeth Soup ; Ketchup of Henry Esmond will be given free". I passed a doctor's shop where patient was wailing about his indigestion due to overeating

"Don Quixote". The doctor told him to take 'Moonstone' and run for 'Treasure Island'.

Near the last house of the row I saw a man coming out of a door, and hastily shut it after him. I heard the bang of a wooden notice on the door. By this time, I had reached near the door. Painted on the wooden notice on the door, "...Don't you enter with Romla in your hands"

There the town ended but it reminiscences still linger on in my mind.

Rifat Ullah Khan IV Year

A QUIZ

They say in Goal Bazar was seen
A striking, puzzling thing,
That walked, and in walking displayed
A pause to sway and swing.

It was no animal or man
A beggar nor a king,
It was nothing existing on earth
And yet it was something.

Photographers their studios left
And in a mass they curled,
Snap after snap they took of this
Thing from another world.

The milkman, taking off his cap,
remarked : " I must respect
A lovely calf of such a build
Though horns he has not kept".

The tailor took his goggles off
Replacing them by others
Then ran he hurriedly to warn
His other tailor brothers.

The bakery man peeped out and said,
As he intently looked,
A walking cream roll it's for sure,
But big and not well cooked.

The booksellers stood stunned and shocked,
And said it came in fiction.
Then for some book in vain they searched
Which could give its description.

The chemists watched andsaid it was
A formula quite new,
With Zn and orange squash,
All mixed up in Cu.

The general merchants were all shocked,
They ran and left their shops,
To report the puzzling matter to,
The worried nervous cops.

The children cried in fear and ran,
As fast as any hare,
But oh! The youngmen of the town
Followed it every where.

A wise, old man then said, "it is
Pied piper, come a-new,
To lead our young man out of town
And leave us again a few."

Fear not my friends, and do not
Be angry, but rather enjoy,
In fact it was a simple thing
A simple teddy boy.

Naseer Ahmad F.Sc. (II) Med.

BELIEVE IT OR NOT

The most remarkable man alive

When Johny Eck was born, it did not seem possible that he could survive for more than a few hours. The tiny body had no legs and his torso had no abdominal region. He was no more than one third of a baby, a vertiable human fraction.

But Johny did survive and has become the most remarkable man of his kind alive. He is an expert typist, acrobat and entertrainer. He is good draftsman, an orchestra leader and composer. He is a piggler, tightrope walker and magician and most unbelievable of all a remarkable dancer.

He went to school like other boys of his age, except that he walked on his hands. He was graduated from high school at the ege of 14. He played baseball, tag, and hide-and-seek. He is an excellent swimmer and diver.

Lack of complete body has not handicaped Johny's health. He eats anything he wants and has never known a day of illness. His disposition is remarkably sunny, reflecting a complete enjoyment of life.

Almost as incredible as Johny's survival is the fact that he has perfectly normal twin brother. Both were born in Baltimore, August 27, 1910.

Man is distinguished from animals by his ability to speak. Next to the great miracle existance, there is no greater-

marvel than the translation of all life into human speech.

There is a tragic exception. There exists on earth one tribe of humans who have never uttered one word in all the millennia since they began to roam the earth. These strange people are the 40,000 Qurungua Indians who live in the forest of Eastern Bolivia. They are born with a strange material construction in their throat which, combined with defective vocal cords, make it impossible for them to utter a single word.

I am Grimaldi

The story has been told of about a greatmany famous clowns, but it is true only of Joe Grimaldi (1779-1837).

One evening in 1808, gaunt sad-faced man entered the office of Dr. James Hamilton in Manchester. The Dotor was struck by the melancholy appearance of his visitor. He inquired "Are you sick?"

"Yes doctor, sick of a mortal malady"

"What malady?"

"I am frightened of the world around me. I am depressed by life. I can find no happiness anywhere, nothing amuses me, and I have nothing to live for. If you can't help me, I shall kill myself."

"The malady is not mortal. You only need to get out of yourself. You need to laugh; to get some pleasure from life."

"What shall I do?"

"Go to the circus to night to see Grimaldi, the clown. Grimaldi, the the funniest man alive. He will cure you."

"Doctor, "said the sad-faced man, "I am Grimaldi"

The first air express delivery was made 962 years ago. The Caliph Aziz of Cairo (975-990) sent a rush order for cherries to the town of Baalbek. Six hundred pigions made the delivery.

The Velocity of a cough is 245 miles an hour.

Watch oil is the most expensive petroleum product. It costs 800 a Gallon.

He Ate His way to a Throne

In 1875 the throne of the fabulous Indian State of Broda was vacant. The British Governmet authorized the wife of the late Maharaja to select a new ruler from among the young villagers of the hamlet of Kavlana. The police rounded up a gang of untotored and unspoiled village youngsters and brought them to Broda for the test. The Maharani Jamnabai decided to subject the boys to an eating test. The boys were clumsy and unfamilier with good table manners. Only one youngster won. He was a 12 years old urchin named Gopalrao. He was as crude as the rest, but smart enough to watch the Maharani, to imitate her demeanour at the table. She awarded throne to him.

This one of the most astounding of all "rags to riches" stories Gopalrao succeeded to one of the greatest fortunes in world. The personal wealth of Maharaja of Baroda has been calculated as exceeding one billion dollors. The 12 year-old urchin assumed name of Gaikwar Sayajirao III and ruled for 4 years.

Why is an Eating Place called a Restaurant?

Until 1766 eating places were always part of a hotel or an inn. In that year a Chief named Boulanger opened the first public dining place in Paris. The owner placed a sign in front of his establishment. The sign bore an adaptation of the famous quotation.

"Come unto me all ye that are hungry and I shall restore you".

From the word "restore" (in French "rstaureri") the establishment became known as a "Restaurant" and his name has been applied to eateries the world over.

What is Happiness?

The Caliph Abdur Rehman III (891-962) ruled the most powerful empire in the world for 49 years. He had an annual income of $ 336,000,000 and the most powerfull Army and Navy of the period. He was ths father of 618 children. He was wise and led a life of fabulous magnificence. He accumulated for $ 2,600,000,000 yet when his will was opened it was found that he had written:

> "All during my long and glorious reign I have counted the days when I enjoyed complete happiness and found them to have numbered only 14".

Why They are called Tanks?

The British first began to build cars based on the American caterpillor tractor in 1915. It was feared that the enemy might learn of the new weapon too soon. The factory foremen were instructed to reply to questions that the strange vehicles were "cisterns". Built to carry water to the British troops in Sahara. The cars were known as "Cisterns" for some time, but the word proved cumbersome and long. A

much shorter word meaning the same thing was substituted. The word was "Tank".

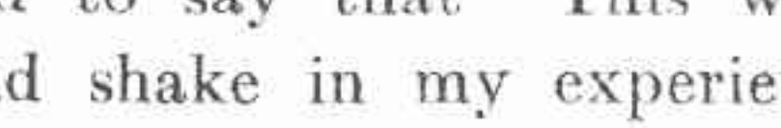

Armless Artist.

Charles Felu (1830-1900) of Belgium born without arms, was famous and most talented artist of the 19th century. He painted many master-pieces and signed them all "Pede Pinxit"—painted with a foot. Belgium and Russian royalty patronized him assiduously. Three kings and an Emperor were among his friends. He was proud of the fact that his foot was shaken by many royal hands. King Leopold of Belgium used to say that "This was the coolest and most pleasent hand shake in my experience."

The Woman General

A woman served the British Army for 52 years without being recognized.

Her name was Dr. James Barry of Edinburgh (1795-1865) grand daughter of a Scottish earl. As a result of an unfortunate love affair she decided to pose as a man and entered the Army in 1813. She passed through all military grades and rose to the rank of General in the Army Medical Corps. She was redheaded, of a quarrelsome temper, a succsessfull duelist and was described as a most skillful physicean and most wayword "man".

She died in London and not untill after her death was the secret of her sex discovered. Not even her servant who had been in close attendence upon her 50 years, ever suspected her secret.

[Adapted]

Punjab University Basket Ball Champions

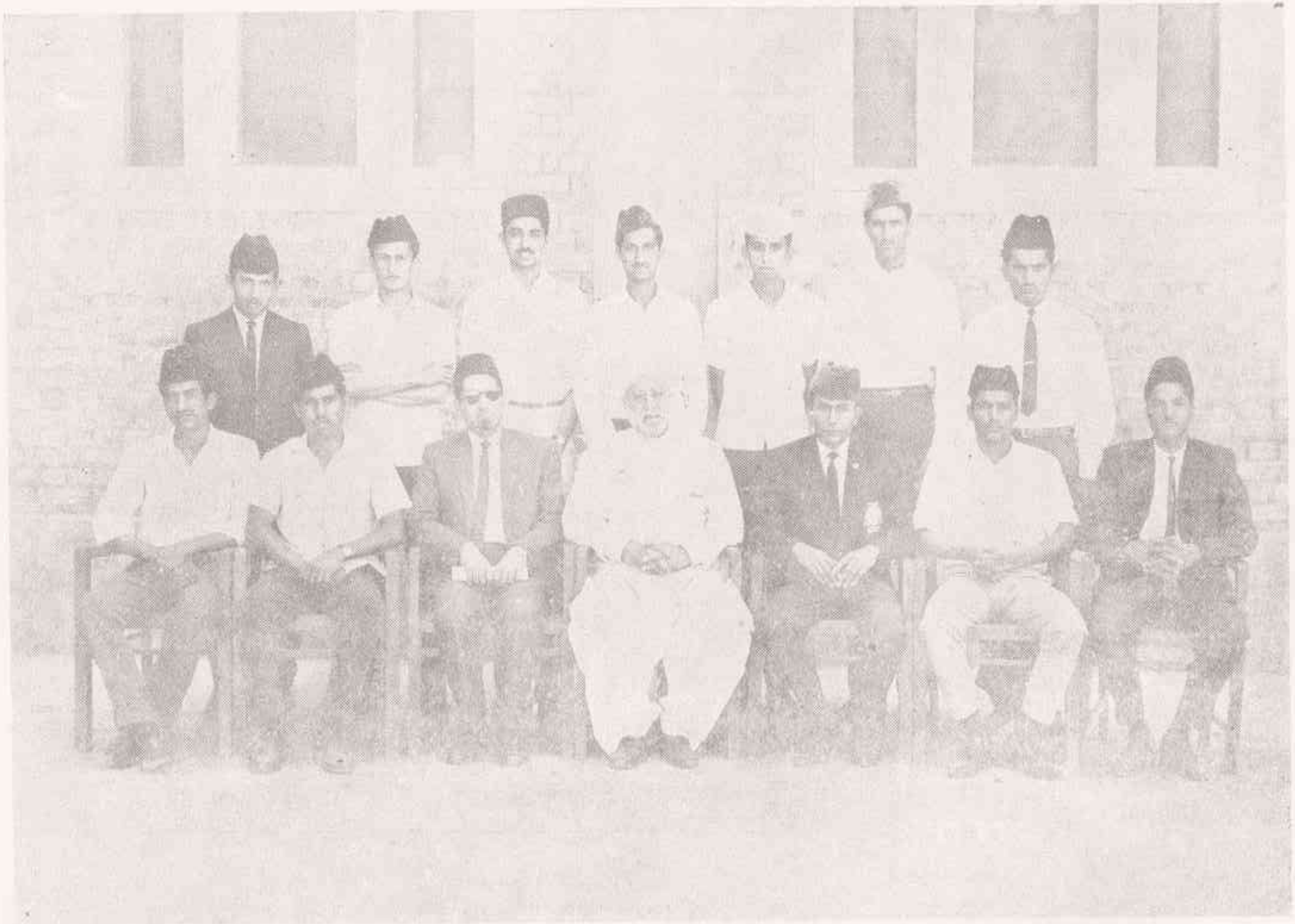

Chairs (*L to R*) Rafiq Qamar ; Naseer Bunda; Ch. Mohammad Ali M.A. (*President Basketball*) ; Sahibzada Mirza Nasir Ahmad M.A.,(Oxon) *Principal* ; Khalid Taj (*Captain*) ; Majeed, Latif.
Standing (*L to R*) Ishaq Tariq; Naseer Shah ; Mansoor ; Naeem ; Basharat ; Mubarik ; Muzaffar.

Naeem Ozmaan (African) II year

MODERN YOUTH

Youths throughout the centuries have been looked upon as the future leaders of the country and the leaders in turn are supposed to be the countrie's guardians. The leaders are expected by the public to safeguard their rights, dignity, prestige, honour, property, life and the country from all internal and external, social, economical and political evils. Thus the qualifications of a leader are immense.

We the youths of today are leaders of tomorrow, for the leaders of today have no permanent licences to leadership. Sooner or later they have to hand over the responsibilities to the leaders of tomorrow and we the leaders of tomorrow are expected to do all and more than a leader ought to do ; raise the prestige of the country ; improve its social, cultural and moral standard and set a good example for the new gereration as Jinnah, Ghandi, Nehru, Churchill and Lincoln set for us. A lot is expected from the youths of today and all look towards them with high hopes. But the question is, are we the present modern youths going to prove ourselves true leaders of the country ? Are we going to fulfill the dreams of the public ? Are we going to set a good example and lead the country towards prosperity ? Only time can give a correct answer to all these enquiries. But it is not impossible to judge it beforehand though it cannot be predicted.

To predict anything we have to see what the modern youths are ? And do we at this age carry any responsibilities and morals ? All this we can judge by seeing and going a

bit deep in the lives and doings of the modern youths. So let us see what our modern youths are and do.

First of all we will discuss a modern boy. Long pointed sharp noched, high heeled boots; skin-tight trousers, dark coloured check shirts; thick heavy leather jacket, silk scarf, big Kansas-Kid or Kit Carson hat; Beatles or hero-cut and a chain on the wrist makes our modern boy. Going to the barber he specially instructs for a Beatles or a Hero-cut and going to a tailor he askes for his trousers to be tightened as much as possible.

Sharp noched, high healed pumpies; tightest possible shalwars; tight sleaveless '*Kameez*'; thin rope-like taffta chuni; coloured headgear; long sharp nails and a lot of make-up make our modern girl.

This is the appearence of a modern youth that can be recognised at the first sight. Now let us see how he or she passes the young days of his or her life.

Cinemas, theatres, teenage clubs, night clubs, crowded gardens and parks, densely crowded bazaars, restaurants, cafes bars and hotels are the resorts of them instead of public libraries, religious centres, mosques, temples, churches and other praying centres. The feel it below their dignity to sit, stand or walk anywhere except in a *heau monde*.

Creations of new teenager's and youth's clubs under the banners of their idols viz; Ricky Nelson, Elvis Presley, Cliff Richard, Beatles and other film stars and singers is the main ideal of them. All the towns and cities affected by modernisation possesses such clubs in different corners. Seeing young boy and girls dancing to the tunes of the hit songs; drinking Coca-Cola and at times alcohols; smoking different brands of cigarettes

chewing gums ; eating roly-poly and hot dogs ; enjoying twist, cha-'cha- cha' and 'rock-n-roll' is a common sight in these noisy, suffocating smoke filled rooms of the clubs.

In bazaars, loving birds are commonly seen hands clasped roaming aimlessly. *Affaire-de-coeur* is not at its height only among the college students but is considerably increasing among the pupils of the schools.

Billet doux comprise most of the part of our modern youths correspondance and 'de luxe' editions of love, sex, filmworld and romance are their leisure study books instead of the editions by the torch bearer of literature.

Those so called unlucky ones who because of lack of funds or some other circumstances are unable to join the clubs or have private 'affair de couer' can be seen standing on street corners or besides lamp post, teasing, whistling, passing dirty remarks and cracking moralless jokes on girls of good families.

The modern youths community is at a '*bon ton*', and those days when the moon and the stars were thirsty to see the girls of the families inside the four walls of a poorly built houses are gone. Today the same are fed up of seeing them nearly naked.

Dresses of our youths are changing rapidly. From decent long gowns they dropped to *shalwars* and *kameez* ; then to blouse and skirts ; then to sleavless large necked and now to topless after bikinis. God knows what is going up to be the next craze. A poem can rightly fit here.

Sirens are singing on every hand,
Luring the ear of youth,
Guided falsehood with silver notes,
Drowneth the voice of truth,
Daintly ladies in costly robes,
Your parlours gleem with light,
Fate and beauty your senses steep,
Where are our youths to night.

These are a part of the activities and outlooks of a part of our modern youths community. It is rather difficult to go much deeper into them for that would not be frank confession but indecent exposure.

Let us here try to judge now if our present or modern youths are going to be reliable future leaders? Are they going to gain prestige for the county or lead it towards doom? Will they set an example or disgrace the ones already set.

After gaining the knowledge of all a modern youth does, I can only conclude that the Modern youths should not be relied upon as the future leaders of the consruction of a country. Anyway, I leave the question to the readers for one's own judgement is the best. If the reader is for the modern youths, I can only pray, "May Allah give him understanding", and if he is against then, "May Allah grant him courage to reform the society" and recite the poem :

Turn their feet from the evil paths;
Ere they have entered in,
Keeping them unspotted while they may,
Earth is so stained with sin,
Ere they have learned to follow wrong,
Teach them to love the right
For if they don't realise it then
Pitfalls lurk in the flowery way,
Vice has a golden gate,
Who shall guide their unwary feet,
Unto the highway straight.

"Anyway, May Allah be with them, me and all".

Munawar Ahmad Malik
B.A. Part I

Greatest Example of Endurance on Record

Poon Lim, Chinese seaman spent 133 days alone on a raft His ship was torpedoed off South Africa aud he drifted across the Atlantic to Belem Brazil where he was rescued. Here's Poon Lim's own story :

"I was on the raft for 133 days before I was picked up by a fishing boat a few mile out of Belem, at the mouth of Amazon. My boat was tarpedoed just after we left Capetown South Africa. I saw five of the crew jump to one raft, and I made the other. The rest were lost.

"I had no fear. I was strong, My father was the Jack Dempsey of Hainan. We eat goat meat, which makes us strong. A few days after our ship was sunk, I saw another a mile away. I set up flares and lighted candles, although it was noon. The ship saw me, but turned its course away from me.

"For fifty five days I had water and crackers and I felt fine and slept well.....Of-course, I was blistered by the sun, but I swam part of the time to keep my muscles in shape. Then the water gave out and I gathered enough rain water to carry me for another ten days. My diet then was fish and birds. I would gather the sea weeds and barnacles that attached to my raft, and made nests on the raft for birds, and at night they came to the nests and caught them.

"I took the wire from electric blub on tne raft and made a fish hook. Then I split rope to make a fish-line and caught enough fish to feed me for hundred and thirty three days. The sun dried the fish, and frequently I could

catch a small shark and eat the liver. I had little trouble with the sharks although they used to grind their teeth on the bottom of my raft, but they chased little fish towards my boat and they were great company.

"I saw one submarine a month after my raft started floating to no-where. The submarine was surfaced but paid no attention to me. I was unconcerned with my fate. I have a wife. I thought of her constantly. When I would be without fish or rain water for few days, and then rain would come, I would say to myself: 'Well, I guess the devil is not 'ready to take me'.

I am told that when men came off rafts in other parts of the worlds, they were too weak to walk. I had lost only ten pounds and was quite strong enough to walk on the pier. An American petrol plane sighted me and circled me three time, but apparently could not get help to me. So I just floated across the ocean from Africa into the mouth of Amazon, and there I was picked up by fishermen. I must have looked like a monkey with a full beared; I was black from the sun. They gave me red beans and latter a chiken.

"Then the red cross took charge of me and kindly sent me here by plane. On may 6, 1943 just after I landed Brazil the English club at para headed by I.E. MucDonald, gave me a purse and a testimonial for my endurance. They presented me with a wrist-watch".

Poon Lim survived 47 days longer than man have ever been known before to endure the rigors of a life boat raft. He became adopt at catching birds and fish and trapping rain water on his emergency rations ran out at the end of 60 days.

(*Adapted*)

قریشی مقبول احمد ایم اے (عربی)
الدرجة النهائية

و اوحى ربك الى النحل

ان الله تعالى خلق الكائنات وأعطى كل شئ هداه وجعل الانسان أفضل خلقه و سخرله ما فى السموات والأرض من الجمادات والنباتات والحيوانات وعندما نطالع عجائب قدرته فى الحيوانات خصوصاً و نشاهد عظائم حكمته فيها فنجد بعضها أحسن نموذجا للانسان و متصفا بأوصاف حميدة فأريد ان ابين خصوصاً عن النحل التى قال الله تعالى فيها

و اوحى ربک الى النحل ان اتخذى من الجبال بيوتا ومن الشجر
و مما يعرشون ثم كلى من كل الثمرات فاسلكى سبل ربک ذللا
يخرج من بطونها شراب مختلف الوانه فيه شفاء للناس ان فى
ذلک لاية لقوم يتفكرون (٦٩ : ١٦)

ففى حيوة النحل هنالک عبر و دروس للانسان فمنها درس نظامها الجيد فانما لاتعمل لاحسان عملها الا تحت رياسة رئيسها المسمى بيعسوب و من اللطائف بأنهم زعموا بأن رئاسته امالاقتدار الذكر على الاناث وامالما فى طباع الاناث من حب ذكورتها اے ولو لم تامرها الفحول تتبع وتطيع هى لحبها للذكورة فالحب الطبعى يحثها على طاعة الذكورة ـ فعندما تريد النحل ابتداء العمل فتجتمع و تقسم الاعمال بينها فمنها ما تعمل الشمع ومنها ما تبنى البيوت و منها ما تستقى الماء و تصبه فى الثقب ثم تلطخه بالعسل ـ و عموما تبتدئ العمل بكرة و تداوم عليه الى المساء فتؤب الى مآبها ـ فالنحل تؤدى هذه الاعمال طبقا للفطرة التى فطرها الله عليها ـ ولا تكسل فى آدائها أبدابل تجتهد و تسعى الى ان يتم العمل وكل شئ يوجد مهيأ وكاملا

فالله تعالى الذى أخرج من بطون الامهات لبنا خالصا سائغا للشاربين ارسل النحل الى الثمرات المختلفة و الازهار المتنوعة الموجودة فى أمكنة شتى و جعلها تسلك سبل ربها ذللا فتاخذ الشمع والعسل من الاشجار والأزهار التى تحملهما فى صورة اخفى لا يراهما و يعلمهما أحد الا النحل التى اودعت من الله تعالى هذه الصفة العليا فتقتنيها و تقتبسها فيخرج الله بعد ذلك من بطونها عسلا مصفى مختلفاً الوانه حسب الاماكن وطبق الثمرات و الأزهار الموجودة فى تلك المواضع لكى يستفيد به الناس و يحصلوا الشفاء فتبارك الله احسن الخالقين ـ ان الله تعالى بين خروج الشراب من بطونها و فى الحقيقة العسل ليس بشراب بل هو شئ يحول بالماء شراباً فسماه تعالى شرابا اذ كان يجىء منه شراب ـ و هذا العسل يحصل بالحيل المختلفة وبالطرق المتباينة التى يعلمها الانسان بعد تجارب شتى على رغم النحل التى تدافع و تلسع الانسان ان أمكنت على ذلك .

ثم تحصل الفوائد من العسل فى أمراض متعددة خصوصا فى أمراض البطن و أمراض الدم ـ فهنالك حديث مروى عن أبى سعيد الخدرى أن رجلاً اتى النبى صلى الله عليه وسلم فقال ان أخى ليشتكى بطنه فقال (عليه السلام) اسقه عسلاً ثم أتاه فقال قد فعلت قال اسقه عسلا ثم أتاه فقال قد فعلت فقال اسقه عسلا. ثم اتاه الرابعة فقال صدق الله و كذب بطن أخيك اسقه عسلا فسقاه فبرأ الرجل و فى الاثار أيضا بينت فوائده فبعض الناس قالوا ''ليس للمريض عندى دواء الا العسل وبعضهم رووا أنه كان يعجبه اذا استمشى الرجل أن يشرب اللبن و العسل ،، و بعضهم أخبروا ''عليكم بالشفائين القرآن و العسل ،،

ثم نعلم بالتجربة بأن العسل يحفظ اللحم الغريض الموضوع فيه لمدة فانه لايتغير بل يبقى طريا فيمكن للانسان ان يستعملة بعد شهر كاللحم الطرى ـ

و العسل يضرب مثلاً لصفاءه فيقال ,,ماء كانه العسل ،، ولحلوه فيقال فى شى ما ,,كانه العسل ،، او هو معسول اللسان فيراد حلوه و تأثير كلامه .

ثم نعلم من القرآن المجيد بأن الله تعالى قال فى سورة محمد :

مثل الجنة التى و عدالمتقون فيها أنهار من ماء غير آسن و أنهار من لبن لم يتغيرطعمه و أنهار من خمر لذة للشاربين و أنهار من عسل مصفى فهنا ذكر الله تعالى أنهار الجنة وجاء بذكر أنهار العسل فى الأخير لكى يدل على تفضيله على الانهار الأخرى المذكورة ـ

فحيوة النحل و نظامها و الفوئد التى نحصل منها تحث الانسان أن يجتهد اجتهادا أحسن منها لأنه أشرف المخلوقات و سخرله ما فى السموات والارض و علمنا علماً يقينياً بأنه قادر على اتيان العجائب و على تسخير الاشياء بشرط أن يستعمل جميع قواه الفطرية فى استخراج الفوائد التى أودعت فيها فعليه آن يتفكر دائما فى خلق السموات والأرض و يحسن التدبير لحصول كنه الاشياء و معرفة حكمها و فوائدها لكى يستعملها لا فادة نوعه و تسهيل امسوره و يجعلها وسيلة لحصول المراتب الروحانية

اطرح الدنيا فمن عادا تها
تخفض العالى و تعلى من سفل
لاتحقرن شان العدو و كيده
ولربما صرع الاسود الثعلب
لا يحمل الحقد من تعلو به الرتب
ولا ينال العلى من طبعه الغضب
و اذا اتتك مذمتى من ناقص
فهى الشهادة لى بانى كامل
و عين الرضا عن كل عيب كليلة
كما ان عين السخط تبدى المساويا
يموت الفتى من عثرة من لسانه
و ليس يموت المرء من عثرة الرجل

لسان الفتى نصف و نصف فؤاده

ان الله تعالى خلق هذا العالم و خلق الانسان و علمه البيان وجعله اشرف المخلوقات ـ كل عضو من أعضاء الانسان ذوا أهمية ولكن لسانه وقلبه من اهم الاعضاء فى جسده ـ لاجلهما يقال له اشرف المخلوقات ـ وبغيرهما ماالانسان الا الحيوان الذى يشرب ويأكل ويسمع وينظر فقط ـ

ولا يستطيع الحيوان ان ينطق ولا يقدر على اظهار جذباته وأفكاره ولكن الانسان يملك حربة وهو اللسان الذى يستعمله فى طرق شتى و يحصل الانسان المدارج العالية فى المعاشرة بلسانه

العرب فى الجاهلية كانوا يعطون الشاعر السيادة و اذ كان ينشأ الشاعر فى قبيلة فكانوا يسرون ويهنئون به بعضهم بعضاً كان كلام الشاعر يعد من الاسلحة القوية الذى كان يغلب بها على اعدائه و يؤثر قلوب الناس تاثيرا عظيما ـ

لما ادعى رسول الله صلى الله عليه وسلم النبوة جعلوا يؤذونه بألسنتهم وباسلحتهم ـ اول من هجا منهم عبدالله بن الزبعرى وعمرو بن العاص و ابوسفيان ، فآذوا الرسول واتباعه بقوارص الهجاء ـ فثار بذالك الشعراء و ودوا لو ياذن لهم الرسول بردالهجاء عليهم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم

,,ماذا يمنع الذين نصروا الله و رسوله بأسلحتهم أن ينصروه بألسنتهم ،،

فقام من المسلمين نفر منهم حسان بن ثابت ، و كعب بن مالك و عبدالله بن رواحة رضى الله عنهم فجردوا على شعراء الكفار حربة شعرية حتى اعجزوهم وختموا على ألسنتهم ـ

ان اللسان يدل على شخصية الانسان فى الحقيقة وبه نعلم أهى سئية ، ام حسنة ـ و ما نستطيع ان نقول شيأ حتى ننطق باللسان يستطيع الانسان أن يظهر

شخصيته بطريق صحيح ـ دليل عقل المرء قوله و دليل اصله فعله واللسان ترجمان القلوب ـ

وباللسان نفرق بين العدو والصديق لان اللسان يظهر عواطف القلب

قد قال النبى صلى الله عليه و سلم البلاء مؤكل بالمنطق و السكوت يفيد الانسان فى بعض الاوقات ـ وسلامته فى حبس اللسان ـ وجرح اللسان اشد ايلاماً واصعب التئاما من جرح السنان ـ راحة الجسم فى قلة الطعام وراحة الروح فى قلة الكلام ,, وان مع العسر يسراً ،، و بهذا الطريق الانسان يستفيد ويخسر بالنطق ويجتنى الانسان المعائب العظيمة باستعماله فى غير موضعه ـ

فالجزء الاخر هوالقلب ويظن ان معنى القلب جذبات فقط و يفكر الدماغ ولكن هذا ليس بصيحح ـ

القلب فى جسد الانسان مثل الملك والدماغ كالوزير لان المركز هوالقلب والاعضاء الاخرى فروعه ـ

,, لاشعور ،، يشتمل على الاجزاء التسعة من العشرة و الجزء العاشر هو الشعور الذى مركزه الدماغ والقلب مركز الروحانية و سمى القلب لانما نقدر ان نعكسه ونستعمله فى حب او فى عداوة فالمرء باصغريه قلبه ولسانه ـ

ارتقاء الانسان الى المدارج العالية ينحصر عليهما فينبغى للانسان ان يصلح قلبه ويحبس لسانه و يمكن للمرء كل فوز فى الدنيا باستعمالهما الصيحح وان يک قلبه مركز الافكار السيئة يكن المرء مرتكباً للافعال الشنيعة ـ

وهكذا يهان المرء بأن يفسد لسانه وهذا هو الفرق بين الانبياء و عامة الناس ان قلوب الانبياء ولسانهم صالحة ـ

و لا يمكن للانسان ان يجد قرب الله بغير تزكية القلب والنفس ـ وقد قال النبى صلى الله عليه وسلم :

الا ان فى الجسد مضغة اذا صلحت صلح
الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله

ولايهان المرء الذى يصلح قلبه و لسانه

شخصيته بطريق صحيح ـ دليل عقل المرء قوله و دليل اصله فعله واللسان ترجمان القلوب ـ

وباللسان نفرق بين العدو والصديق لان اللسان يظهر عواطف القلب

قد قال النبى صلى الله عليه و سلم البلاء مؤكل بالمنطق و السكوت يفيد الانسان فى بعض الاوقات ـ وسلامته فى حبس اللسان ـ وجرح اللسان اشد ايلاماً واصعب التئاماً من جرح السنان ـ راحة الجسم فى قلة الطعام وراحة الروح فى قلة الكلام ,, وان مع العسر يسراً ،، و بهذا الطريق الانسان يستفيد ويخسر بالنطق ويجتنى الانسان المعائب العظيمة باستعماله فى غير موضعه ـ

فالجزء الاخر هوالقلب ويظن ان معنى القلب جذبات فقط و يفكر الدماغ ولكن هذا ليس بصحيح ـ

القلب فى جسد الانسان مثل الملك والدماغ كالوزير لأن المركز هوالقلب والأعضاء الاخرى فروعه ـ

,, لاشعور ،، يشتمل على الاجزاء التسعة من العشرة و الجزء العاشر هو الشعور الذى مركزه الدماغ والقلب مركز الروحانية و سمى القلب لانما نقدر ان نعكسه ونستعمله فى حب او فى عداوة فالمرء باصغريه قلبه ولسانه ـ

ارتقاء الانسان الى المدارج العالية ينحصر عليهما فينبغى للانسان ان يصلح قلبه ويحبس لسانه و يمكن للمرء كل فوز فى الدنيا باستعمالهما الصحيح وان يک قلبه مركز الافكار السيئة يكن المرء مرتكباً للافعال الشنيعة ـ

وهكذا يهان المرء بأن يفسد لسانه وهذا هو الفرق بين الانبياء و عامة الناس ان قلوب الانبياء ولسانهم صالحة ـ

و لا يمكن للانسان ان يجد قرب الله بغير تزكية القلب والنفس ـ وقد قال النبى صلى الله عليه وسلم :

الا ان فى الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله

ولايهان المرء الذى يصلح قلبه و لسانه

عطاءالمجيب راشد
ايم اے عربى الدرجة انتهائية

فاكهة الفكاهات

* قيل لطالبة علم : ,, كم اثنان و اثنان ،،
فاجابت بالسرعة : ,,اربعة ارغفة،،

---

* كان تلميذ غافلاً عن تعليمه و قد تعود ان يتسلل من المدرسة ـ فلما علم ابوه هذه الغفلة زجره و غضب عليه غضباً شديداً ـ فسئل الرجل ابنه
,,لما لاتذهب الى المدرسة ؟ ،،
فاجاب الولد : ,,لان الاستاذ يضربنى ضرباً شديداً،،
,,ولما يضربك الاستاذ؟،،
,,لانى لااذهب الى المدرسة،،

---

* ذهب الناظر العلمى للمعائنة فى احدى مدارس البلد و كان اعور ـ فلما دخل فى صف من الصفوف الابتدائية سئل ولداً صغيراً :
,,كم عين لرجل،،
فقام الولد من مجلسه و قال :
,,اثنان يا سيدى،،
ففرح الناظر من الجواب ـ و سئل مرة اخرى : ,,و كم عين لرجل ؟،،
فاجاب المتعلم : ,,ثلاث يا سيدى،،
تعجب الناظر من الجواب و قال
,,و كيف هذا ؟،،
,,اثنان لى و واحد من عندك،،

* لطمت الوالدة ابنها راشداً على العصيان فبكى واختفى نفسه تحت السرير - فلمارجع ابوه عند المساء سئل عن ابنه فاخبرته المرأة انها قد ضربتها و هو الان غضبان على و قد اختباء نفسه تحت السرير - فتأسف الوالد على الوقعة و قصد الى ارضاء الولد فتقدم الى السرير و جلس عنده و مد يده الى الولد - فلما را الولد اباه يدخل تحت السرير مثله ، سئله متعجباً :

"أضربتك والدتى ايضاً ؟"

---

* كان خطيب يخطب فى حفلة حول موضوع دينى - فتبين حقيقة الحياة الدنيوية والاخروية - وذكر فضائل كثيرة للحياة الآخرة و حرض الناس على اختيار الاخرة والعمل لحصولها - فى آخر خطابه قال لهم متسائلا :

"انكم قد علمتم حقيقة الاسرين فما ثمن الحياة

الاخرة عندكم ؟"

استيقظ تاجر من السامعين فى ذالك الوقت - و لما سمع هذا السوال من الخطيب صرخ دفعة :

"ثلاث روبيات لكل دزينة"

---

* كان لامراة صوتاً قبيحاً لايلائم الاذان - ولكنها كانت تغنى بصوت عال يسمع فى الدور المجاورة - فمنعها زوجها من الغناء و لكنها لم ترض واصرت على غناءها فبعد ذالك كلما ابتدأت بالغناء ، كان زوجها يخرج من البيت و يهوم خارج المنزل - تعجبت المرأة على عمل زوجها و سئلته يوماً :

"لما انت تخرج من البيت كلما اغنى؟ أما يسرك صوتى

و لا تحب ان تسمعه ؟"

قال : "لا - بل اذهب خارج المنزل لئلا يظن الناس بانى اضربك و انت تبكى من شدة الضرب"

---

* كان خطيب مشغولا فى خطابه و قد جاد فى تحسينه حد الامكان - كان رجل واحد متاثرا من خطابه دون سائر السامعين - حتى غلب عليه كيفية الخشوع والخضوع فجعل يبكى بكاء الطفل ودموعه كانت تنحدر على خدوده فتعجب الناس على حالته و تعجب الخطيب ايضاً - لان خطابه ما كان موثراً جداً - فلما اختتمت الحفلة اخذ الخطيب بيد الرجل و اعتزل عن الناس و سئله عن سبب بكاءه وقال :

"انما انت رجل واحد بكى على خطابى فاى شيئى استحسنت كثيراً حتى ابكاك ؟"

فاجاب :

"ما استحسنت شيئاً ايها الواعظ ! و ما بكيت من اجل تاثير خطابك - ولكنى لما رايتك تحرك رأسك و رأيت لحيتك تتحرك مع الرأس و سمعت صوتك الخشن - ذكرت ماعزتى التى ماتت بالامس و كانت مثلك فى الصورة والحركة والصوت"

ذهب رجل سمين شحيم الى حديقة الحيوانات و دار حول اقفاص السباع فلما بلغ الى موضع الفيل رغب فى ركوبه فركب الفيل و جعل يسوقه - فمر طفل من هنا و ضحك لما راء الرجل يركب الفيل - فسئاله الرجل :

"لماذا تضحك ؟ أما رأيت فيلاً قبل هذا ؟"

فاجاب الطفل :

"لا-بل رأيت فيلاً - ولكن ما رأيت فيلاً على فيل"